ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

عصرِ حاضر کے چند اہم سماجی مسائل اور اسلام
محمد رضی الاسلام ندوی
حضرت مجدّد الف ثانی اور احیائے سنّت
ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن
انیسویں صدی میں عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقاء
ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
تدریسِ قرآن میں احادیث سے استفادہ
مفتی جمیل احمد نذیری
دعوت وتبلیغ کے نبوی اسالیب
جناب محمد جنید انور
نورِ محمدی کی اساطیری اختراع پردازی
پروفیسر احتشام احمد ندوی
تعارف وتبصرہ
محمد رضی الاسلام ندوی
مولانا محمد جرجیس کریمی

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ــــــــــــــــــــ ستمبر ۲۰۱۱ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93,ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۰ شمارہ: ۳

جمادی الاخریٰ ——— شعبان ۱۴۳۲ھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۱۱ء

تحقیقاتِ اسلامی کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09760248489

ای میل: tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09412562972

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

عصرِ حاضر کے چند اہم سماجی مسائل اور اسلام — محمد رضی الاسلام ندوی — ۵

تحقیق وتنقید

حضرت مجدّد الف ثانی اور احیائے سنّت — ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن — ۱۷

انیسویں صدی عیسوی میں
عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقاء — ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی — ۳۹

بحث ونظر

تدریسِ قرآن میں احادیث سے استفادہ — مفتی جمیل احمد نذیری — ۵۷

دعوت وتبلیغ کے نبوی اسالیب — جناب محمد جنید انور — ۷۷

نقد واستدراک

نورِ محمدی کی اساطیری اختراع پردازی — پروفیسر احتشام احمد ندوی — ۱۰۱

تعارف وتبصرہ

مذاہب میں عورت کا مقام-ایک تقابلی مطالعہ — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۰۷

ابن شہاب زہریؒ اور ان پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ — ،، ،، — ۱۱۱

احیائے دین اور ہندوستانی علماء — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۲

معاشرتی اصلاح-قرآن کریم کی روشنی میں — مولانا مزمل کریم فلاحی قاسمی — ۱۱۵

ثنائے جمیل — جناب محمد نظام الدین فلاحی — ۱۱۶

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۴۰) — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن
انچارج ریجنل دعوہ سینٹر (سندھ) کراچی،
دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد (پاکستان)

۲۔ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی
ایسوسی ایٹ پروفیسر (عربی) طبیہ کالج، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
سکریٹری ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

۳۔ مفتی جمیل احمد نذیری
مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام، نوادہ، مبارک پور (یوپی)

۴۔ جناب محمد جنید انور
شاہ محمد، ہری پور، ہزارہ (پاکستان)

۵۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی
مدینہ منزل، نیو سرسید نگر، علی گڑھ (سابق صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونی ورسٹی، (کیرلا)

۶۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۷۔ مولانا مزمل کریم فلاحی قاسمی
اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۸۔ جناب محمد نظام الدین فلاحی
شبلی باغ، ہمدرد نگر (اے)، علی گڑھ

۹۔ محمد رضی الاسلام ندوی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

عصر حاضر کے چند اہم سماجی مسائل اور اسلام

——— محمد رضی الاسلام ندوی

گزشتہ چند صدیوں میں مختلف مغربی ممالک میں بنیادی انسانی حقوق کے پُرزور نعرے لگائے گئے اور ان کے لیے زبردست تحریکیں چلائی گئیں۔ اس کے نتیجے میں مطلق العنان حکم رانوں کے لامحدود اختیارات پر قدغن لگی اور بے بس اور مجبور انسانوں کو بہت سے وہ حقوق اور اختیارات حاصل ہوئے جن سے وہ صدیوں سے محروم تھے۔ دھیرے دھیرے عوام طاقت ور ہوتے گئے تو ان کو حاصل ہونے والے حقوق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں آزادی، مساوات اور عدل و انصاف کے تصورات کو فروغ ملا۔ ان کے ثمرات وفوائد سے یوں تو عام انسان بہرہ ور ہوئے، لیکن خاص طور پر عورتوں کو ان کا حظِّ وافر ملا۔ وہ صدیوں سے اپنے تمام حقوق سے محروم تھیں۔ انھیں مردوں کا محکوم اور زیرنگیں سمجھا جاتا تھا۔ ان تحریکوں نے انھیں محرومی اور جبر سے آزادی اور زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے برابر درجہ دینے اور انہی جیسا معاملہ کرنے کی وکالت کی۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) مساوی حقوق (Equal Rights) اور آزادیٔ نسواں (Emancipation of women) کے نام سے برپا ہونے والی یہ تحریکیں اصلاً مغربی ماحول کی پیداوار تھیں اور کلیسا کے جبر اور عورتوں کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر نے اس کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ اس لیے یہ ردِّعمل کی نفسیات کا شکار تھیں۔ تفریط کے ردّعمل میں افراط نے جنم لیا اور حدود و قیود سے ماوراء ہر طرح کی

آزادی اور مرد وزن کے درمیان ہر اعتبار سے مساوات کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ان تحریکوں کے اثرات کو مشرقی ممالک نے بھی قبول کیا اور اگرچہ ان کا تہذیبی و ثقافتی اور تاریخی پس منظر مغربی ممالک سے مختلف اور جداگانہ تھا، لیکن وہاں بھی ان تحریکوں کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور آزادی و مساوات کے ان تصورات کو کافی فروغ ملا۔

اخلاق و اقدار سے عاری ان تصوّرات نے یوں تو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا ہے، لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر نظام خاندان پر پڑا ہے۔ اس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ بری طرح شکست و ریخت سے دوچار ہوا ہے، اباحیت اور آزاد شہوت رانی کی مختلف صورتوں کو فروغ ملا ہے، سماجی ذمہ داریوں سے فرار کا رجحان بڑھا ہے اور اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہوئی ہیں۔

خاندان کی تشکیل مرد اور عورت کے باضابطہ جنسی تعلّق سے ہوتی ہے۔ یہ تعلق ایک دوسرے کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین کرتا ہے، جن کی پاس داری بہتر خطوط پر افراد خاندان کے رہن سہن اور نشو ونما کے لیے ضروری ہوتی ہے، لیکن ذمہ داریوں سے بچتے ہوئے لذّت کے حصول کے رجحان نے ضابطہ کے ساتھ جنسی تعلق کو فرسودہ قرار دیا اور بغیر نکاح آزاد جنسی رابطہ (Pre Marital Sexual Permissiveness) کو سندِ جواز عطا کی۔ یہ دلیل دی گئی کہ اگر نکاح کے بندھن میں بندھ کر کوئی مرد اور عورت ایک ساتھ زندگی گزاریں گے تو کچھ عرصہ کے بعد ناپسندیدگی یا کسی اور وجہ سے الگ ہونے میں قانونی رکاوٹیں ہوں گی، اس لیے زیادہ بہتر صورت یہ ہے کہ بغیر نکاح کے وہ ایک ساتھ رہیں اور جب ان کا جی بھر جائے، ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو جائیں۔ جدید اصطلاح میں اسے Live in Relationship کا نام دیا گیا ہے۔ یہ طرز رہائش ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں مقبول ہو رہا ہے جو اعلیٰ تعلیم کے حصول یا ملازمتوں کے لیے اپنے وطن سے دُور کہیں عارضی طور پر مقیم ہوتے ہیں اور مختلف اسباب سے ابھی ان کے لیے نکاح کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وبا مغربی ملکوں میں تو پہلے سے عام تھی، ہندوستان میں، جو مذہبی پس منظر رکھتا ہے، اسے عموماً ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن اب

دھیرے دھیرے اس کے حق میں فضا ہموار کی جارہی ہے۔اس سلسلے میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلے کا حوالہ دینا مناسب ہوگا۔گزشتہ سال ۲۳/مارچ ۲۰۱۰ء کو سپریم کورٹ کے تین فاضل ججوں پر مشتمل ایک بنچ نے جنوبی ہند کی مشہور اداکارہ 'خوشبو' (جس نے قبل از نکاح جنسی تعلق (Pre Marital Sex) کی حمایت کی تھی) کی پٹیشن پر اپنا فیصلہ محفوظ رکھتے ہوئے ان احساسات کا ظہار کیا تھا:

"When two adult people want to live togather what is the offence? Does it amount an affence? Living togather is not an offence. It can not be an offence"

(اگر دو جوان (مرد اور عورت) ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو اس میں جرم کیا ہے؟ یہ معاملہ جرم تک کہاں پہنچتا ہے؟ ایک ساتھ رہنا جرم نہیں ہے۔ یہ جرم ہو بھی نہیں سکتا ہے۔)

اس سے آگے بڑھ کر فاضل ججوں نے دستور کی دفعہ ۲۱ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حقِ حیات اور حق آزادی کے خلاف ہے، جنھیں دستور میں 'بنیادی حقوق' کی حیثیت دی گئی ہے۔

یہ تو قبل از نکاح جنسی تعلق کا معاملہ تھا۔ بعد از نکاح جنسی آزاد روی کے معاملے میں تو اس سے بھی زیادہ کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔کہا گیا کہ ہر مرد اور عورت، خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، آزاد اور اپنی مرضی کا مالک ہے۔جنسی تعلق کے لیے اس پر جبر تو قابلِ مواخذہ اور موجب تعزیر ہے، لیکن اگر دونوں باہم رضامندی سے یہ تعلق قائم کریں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔قانون کی کوئی کتاب یا عدلیہ کا کوئی فیصلہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں زنا (Rape) کی تعریف یہی ملے گی: Forcible Sexual relation with a person against that person's will (وہ جنسی تعلق جو کسی شخص سے بالجبر اس کی مرضی کے خلاف قائم کیا جائے) گویا وہ جنسی تعلق جو بالرضا

قائم ہو اس پر نہ سماج کو انگلی اٹھانے کا حق ہے، نہ قانون اس پر کوئی گرفت کرسکتا ہے۔

گزشتہ سال تامل ناڈو کے ایک نام نہاد سوامی نتیا نند کی عیّاشیوں کی کہانیاں میڈیا کے ذریعے منظرِ عام پر آئیں۔ سوامی جی کا ایک بڑا آشرم بنگلور سے ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر بداوی ایریا میں واقع ہے، اس کے علاوہ ملک اور بیرون ملک میں ان کے اور بہت سے آشرم اور لاکھوں کی تعداد میں بھگت موجود ہیں۔ ۳۰ رنومبر ۲۰۱۰ء کو کرناٹک پولیس نے ان کے خلاف زنا بالجبر، غیر فطری جنسی تعلق، دھوکہ دہی اور مجرمانہ سازش وغیرہ کے چار جز پر مشتمل کیس فائل کیا۔ چارج شیٹ میں کہا گیا ہے کہ سوامی جی اپنی بھگت عورتوں سے کہا کرتے تھے کہ ''جو عورت بھی ان کی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے خود کو پیش کرے گی وہ معرفتِ الٰہی اور 'موکش' (نجات) سے شادکام ہوگی''۔ پہلے تو سوامی جی نے اپنے اوپر لگائے گئے تمام الزامات سے بالکلیہ انکار کیا، لیکن جب وہ چاروں طرف سے گھر گئے اور انھیں چار و ناچار اعتراف کرنا پڑا تو انھوں نے کہا کہ ''رضامندی سے جنسی تعلق سماج کی نظر میں چاہے جرم ہو، لیکن قانون کی نظر میں جرم نہیں ہے''۔

اس طرح کے واقعات آئے دن میڈیا کی زینت بنتے رہے ہیں۔ جو واقعات قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں ان کے مقابلے میں ان واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سماج کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر انجام پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو جنسی تعلق باہم رضامندی سے قائم کیا جائے گا، دوسروں پر اس کا انکشاف شاذ و نادر ہی ہو پائے گا۔

آزاد روی کی اس روش نے جنس کے معاملے میں متعدد منحرف اور غیر فطری رویّوں کو جنم دیا ہے۔ مرد کا مرد سے جنسی تعلق (Homosexuality) اور عورت کی عورت سے جنسی تسکین (Lesbianism) اس سلسلے کی دو نمایاں مثالیں ہیں۔ دنیا میں ایسے انسان کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو جنسی تسکین کے ان غیر فطری طریقوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ان کے مطالبات سے مجبور ہوکر بہت سے مغربی ممالک مثلاً ڈنمارک، ناروے، سویڈن، فرانس، نیدرلینڈ وغیرہ نے ان منحرف جنسی

رویّوں کو باقاعدہ قانونی جواز عطا کردیا ہے اور ہم جنسی میں مبتلا جوڑوں کو ان تمام حقوق کی ضمانت دی ہے جو روایتی شادی شدہ جوڑوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے بہت سے ممالک اس سلسلے میں قانون کی تشکیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ہم جنس پرستوں کی تعداد تقریباً پچیس لاکھ ہے۔ اگرچہ یہاں کے قانون میں اب تک ہم جنس پرستی کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے، لیکن اب ایسی آوازیں اٹھنے لگی ہیں کہ اسے قانونی جواز عطا کیا جائے اور ہم جنس پرستوں کے بھی روایتی شادی شدہ جوڑوں جیسے حقوق تسلیم کیے جائیں۔ چند سال سے ایک غیر سرکاری تنظیم (NGO) ناز فاؤنڈیشن دہلی اس کے حق میں تحریک چلا رہی ہے۔ چنانچہ جون ۲۰۰۹ء میں دہلی ہائی کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں ہم جنس پرستی کو قانونی جواز دیے جانے کی رائے ظاہر کی۔ فاضل ججوں نے کہا کہ برطانوی عہد کے بنے ہوئے انڈین پینل کوڈ ۱۸۶۰ء کی دفعہ ۳۷۷، جس میں ہم جنس پرستی اور تسکین جنس کے دیگر غیر فطری طریقوں کو قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہے، یہ دستور ہند کی دفعہ ۲۱ سے ٹکراتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ملک کے ہر باشندہ کو زندگی گزارنے کے یکساں مواقع حاصل ہیں اور تمام لوگ قانون کی نظر میں برابر ہیں۔

آزادی اور افادیت کے تصورات نے ایک اور سماجی مسئلے کو جنم دیا ہے، جسے قائم مقام مادریت (Surrogate Motherhood) کا نام دیا گیا ہے۔ کہا گیا کہ عورت اپنی مرضی کی مالک ہے اور اپنے اعضائے جسم کی بھی۔ اس لیے اگر وہ چاہے تو اپنے رحم (Uterus) کو کرایہ پر اٹھا سکتی ہے۔ جو شادی شدہ عورت کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے، جس سے اس کے رحم میں استقرار حمل نہیں ہوسکتا یا وہ اپنی عیش پسندی کی وجہ سے حمل کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی اور بچے کی بھی خواہش رکھتی ہے وہ کچھ پیسے خرچ کرکے کسی دوسری عورت کے رحم کو کرایہ پر لے سکتی ہے۔ اسی طرح اس تکنیک سے وہ عورتیں بھی فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو شادی کے بندھن میں بندھے بغیر زندگی گزارتی ہیں اور فطری تقاضے سے کسی بچے کی پرورش کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے مادۂ

منویہ کی دوکانیں (Sperm Banks) قائم ہیں، جن میں بڑی بڑی اور مشہور شخصیات کے مادہ ہائے منویہ کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ وہ کسی من پسند شخصیت کے مادۂ منویہ (Sperm) کو خرید کر، کسی ٹیسٹ ٹیوب میں اپنے بیضہ (Ovum) کے ساتھ استقرار حمل کرواکے، کسی عورت کے رحم میں بہ صورت جنین اس کی پرورش کرواسکتی ہیں۔ دنیا کے متعدد ممالک مثلاً جارجیا، نیدرلینڈ، بلجیم، یوکرین، اسرائیل اور امریکا کی بعض ریاستوں میں اسے قانونی جواز عطا کردیا گیا ہے۔ بعض ممالک میں قائم مقام مادریت کے ذریعے منافع خوری (Commercial Surrogacy) پر تو پابندی ہے، لیکن دیگر طریقوں سے اس تکنیک کے ذریعہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس صورت حال میں بہت بڑی تعداد میں عورتوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہے اور اس کے ذریعے خاطر خواہ دولت کماتا ہے۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ نے ۲۰۰۲ء میں اپنے ایک فیصلے کے ذریعے Commercial Surrogacy کو قانونی حیثیت دے دی ہے۔ اس کے بعد سے ہندوستان ایک ایسے ملک کی حیثیت سے ابھرا ہے، جہاں دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت کم خرچ پر Surrogacy کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

عصر حاضر کا ایک اہم مسئلہ رحم مادر میں جنین کشی (Foeticide) کا ہے۔ اسے اگرچہ بسا اوقات قبل از نکاح جنسی تعلق کے نتیجے میں استقرار شدہ حمل کو زائل کرنے کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے، لیکن اس کا غالب استعمال اس صورت میں کیا جاتا ہے، جب بعد از نکاح استقرار حمل کے بعد الٹرا ساؤنڈ یا کسی دیگر تکنیک کے ذریعے معلوم کرلیا جاتا ہے کہ رحم میں لڑکی پرورش پارہی ہے۔ اس سماجی رویّہ نے عالمی سطح پر سنگین صورت اختیار کرلی ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان بھی اس سنگین مسئلہ سے دوچار ہے۔ ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء کو انڈین یونین ہوم سکریٹری نے Sensus 2011 کے جو Provisional اعداد وشمار جاری کیے ہیں، ان کے مطابق ملک کی آبادی 1210.19million ہوگئی ہے۔ اس میں مرد (51.54%) 623.7 million اور عورتیں 586.46

(48.46%) million ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب ۹۴۰ ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ گزشتہ دس سالوں میں عورتوں کی تعداد میں اضافہ کی شرح مردوں کے مقابلے میں بڑھی ہے۔ (۲۰۰۱ء میں مردوں اور عورتوں کا باہمی تناسب ایک ہزار کے مقابلے میں ۹۳۳ تھا)۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ بچوں میں صنفی تناسب کا فرق گزشتہ دہائی کے مقابلے میں اور بڑھا ہے۔ ۲۰۰۱ء میں ایک ہزار لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی تعداد ۹۲۷ تھی، جب کہ ۲۰۱۱ء میں ۹۱۴ رہ گئی ہے۔

خاندان اور سماج کا ایک اہم جز بوڑھے ہوتے ہیں۔ ہر فرد اپنی عمر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ اس عمر میں اگرچہ اس کے جسمانی قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں اور وہ دوسروں کا دست نگر بن جاتا ہے، لیکن اپنے قیمتی تجربات اور سرپرستی کے پہلو سے اس کی اہمیت نہ صرف باقی رہتی ہے، بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ موجودہ دور کے تصورِ افادیت نے انھیں ایک بے کار اور غیر مفید فرد کی حیثیت دے دی ہے۔ چنانچہ ان سے نجات پانے کے لیے Old Age Homes قائم کیے گئے ہیں۔ مغربی ممالک میں تو ایسے مراکز عام ہیں، جہاں فیس ادا کرکے یا مفت میں بوڑھے رہائش اختیار کرسکتے ہیں، ہندوستان میں بھی ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ ۱۹۹۸ء کی ایک رپورٹ کے مطابق یہاں ۷۲۸ اولڈ ایج ہومس تھے، جن میں سب سے زیادہ (۱۲۴) کیرالا جیسی خوش حال ریاست میں تھے۔

دیگر اور بھی متعدد مسائل ہیں جن سے انسانی معاشرہ عالمی سطح پر دوچار ہے۔ مثلاً عصمت وعفّت کو ایک شئ بے معنیٰ سمجھ لیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں جسم فروشی نے ایک صنعت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ بہت سی غربت کی ماری عورتیں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے قحبہ گری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ دوسری طرف سیکس مافیا کا بہت بڑا اور منظّم گروہ ہے، جو 'گرم گوشت' کی بین الاقوامی تجارت میں ملوّث ہے۔ وہ پس ماندہ ممالک سے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں معصوم لڑکیوں کو اغوا کرکے یا غریب

والدین کو پیسوں کا لالچ دے کر انھیں ترقی یافتہ ممالک میں سپلائی کرتا ہے۔ بہت سی لڑکیاں شوق میں یا اپنے بڑھے ہوئے اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ پیشہ اختیار کرتی ہیں، لیکن اس دلدل میں پھنسنے کے بعد پھر اس سے نکل پانا ان کے نصیب میں نہیں ہوتا۔

ایک سماجی مسئلہ یہ بھی ہے کہ نکاح دشوار، پُر پیچ اور کثیر المصارف ہوجانے کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں لڑکیاں بڑی عمر کو پہنچ جانے کے باوجود بیٹھی رہ جاتی ہیں اوران کے رشتے نہیں ہوپاتے۔ یہ صورت حال طرح طرح کے سماجی مسائل کو جنم دیتی ہے۔ پھر ناجائز جنسی تعلقات کے نتیجے میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ صحیح خطوط پر نشو ونما اور مناسب تربیت اور سرپرستی سے محروم ہونے کی بنا پر سماج کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

عورتوں کو ہر طرح کے حقوق سے بہرہ ور کرنے کے لیے ایک تحریک برپا کی گئی، جسے نسائیت (Feminism) کا نام دیا گیا۔ اس نے نعرہ دیا کہ عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے مساوی مقام حاصل ہے اور وہ ہر وہ کام کرسکتی ہے جسے مرد انجام دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس تصور نے خاندان کے دونوں مرکزی ستونوں کو، جو حقیقت میں باہم رفیق اور حلیف تھے، ایک دوسرے کا فریق اور حریف بنادیا۔ جب عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے مساوی مقام حاصل ہے تو وہ نظامِ خاندان میں مرد کی ماتحتی کیوں قبول کرے۔ ملازمت اور روزگار کے مواقع نے اسے خودکفیل بنادیا اور مرد پر اس کا انحصار کم یا ختم ہوکر رہ گیا۔ اس کے نتیجے میں اس کی جانب سے سرکشی اور خودسری کا مظاہرہ ہونے لگا۔ دوسری طرف مرد نے اسے قابو میں کرنے کیلے اپنے زور بازو کا استعمال شروع کردیا۔ اس چیز نے گھریلو تشدّد (Domestic Violence) کو جنم دیا، جو آج کل پوری دنیا کا ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کا اظہار اقوام متحدہ کے ایک نمائندہ Yakin Erturk کی ایک رپورٹ سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا ہے:

"Violence against women is a universal

phenomenon that persist in all countries of the world"

(عورتوں کے خلاف تشدد ایک عالمی مظہر ہے جو دنیا کے تمام ممالک میں پایا جاتا ہے)

ان مسائل کے بطن سے دیگر بہت سے سماجی مسائل نے جنم لیا ہے، جن کی وجہ سے نہ صرف خاندان کا روایتی نظام معرضِ خطر میں ہے اور اس کی بنیادیں متزلزل ہیں، بلکہ پورا انسانی سماج ان کی زد میں ہے اور ان کی مار جھیل رہا ہے۔ عالمی سطح پر بڑھتے ہوئے جرائم کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں اور ان کے اسباب و علل پر غور کریں تو ان کی جڑ میں یہی مسائل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اخلاق و شرافت کا جنازہ نکل گیا ہے اور انسانوں کا معاشرہ خالص حیوانی معاشرہ کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ جس طرح حیوانات جنس کے معاملے میں تمام حدود و قیود سے آزاد ہوتے ہیں، اسی طرح انسانوں کے درمیان بھی آزادی اور بنیادی حقوق کے نام پر تمام پابندیاں ختم کی جارہی ہیں۔ جو لوگ ازدواجی تعلقات کے سلسلہ میں ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں ان کے درمیان بھی ایک دوسرے کے حقوق کی پامالی، ظلم و زیادتی، تشدد اور بے وفائی کے واقعات عام ہیں۔ اس کے نتیجے میں زوجین کے درمیان علیٰحدگی اور طلاق کے واقعات کثرت سے پیش آتے ہیں۔ نوعمر لڑکیوں کے اغوا اور ان کے ساتھ زنا بالجبر اور قتل کے واقعات اتنے زیادہ پیش آرہے ہیں کہ ان کی سنگینی کا احساس ختم ہوتا جارہا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان مودّت اور مرحمت کا تعلق کم زور سے کم زور تر ہوتا جارہا ہے۔ والدین اگر اپنے نوعمر بچوں کو آزادی سے منع کرتے اور اخلاقی حدود میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بغاوت پر اتر آتے ہیں اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی ان کی روک ٹوک کو انسانی آزادی میں مداخلت کا نام دے کر اسے قابل تعزیر جرم قرار دیتے ہیں۔

جنسی آوارگی کی سزا قدرت نے ایڈز کی شکل میں دی ہے، جس سے دنیا کے تمام ممالک پریشان ہیں اور کروڑوں اربوں ڈالر خرچ کرنے اور بے شمار احتیاطی

تدابیر اختیار کرنے کے باوجود اس موذی اور بھیانک مرض پر قابو پانے میں ناکام ہیں۔ UNAIDS کی ۲۰۰۷ء کی رپورٹ کے مطابق، دنیا میں تقریباً 33 million افراد H.I.V اور AIDS سے متاثر ہیں۔ ان میں سے تقریباً نصف تعداد عورتوں کی ہے۔ 15 million بچے ایسے ہیں جن کے والدین میں سے ایک یا دونوں ایڈز سے جاں بہ حق ہوگئے ہیں۔ ایڈز سے متاثر ہونے والے نئے مریضوں میں ۱۵ سے ۲۴ سال کی درمیانی عمر کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب ۴۵ فی صد ہے۔ ہندوستان میں، جب کہ یہاں کی آبادی ۲۰۰۷ء میں تقریباً 1129.86 million تھی، ایڈز اور ایچ آئی وی سے متاثر افراد کی تعداد ڈھائی ملین سے زائد تھی۔

یہ ہیں وہ چند سنگین مسائل، جو عالمی سطح پر بھی اور ملکی سطح پر بھی انسانی سماج کو درپیش ہیں۔ ان مسائل نے دنیا کے تمام مفکرین، دانش وروں، سیاست دانوں، امن و قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سماجی مصلحین کو پریشان کر رکھا ہے۔ انھیں کوئی راہِ عمل سجھائی نہیں دے رہی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے اور ان کی گتھیوں کو سُلجھانے کے لیے وہ نت نئی تدابیر اختیار کرتے ہیں، مگر مسائل ہیں کہ مزید الجھتے چلے جارہے ہیں۔ طرح طرح کے قوانین بناتے ہیں، مگر وہ ذرا بھی مؤثر ثابت نہیں ہورہے ہیں۔ فطرت سے بغاوت کا یہ انجام تو سامنے آنا ہی تھا اور اس کے کڑوے کسیلے پھلوں کا مزہ تو چکھنا ہی تھا۔

اسلام نے خاندان اور سماج کا جو تصور پیش کیا ہے وہ موجودہ دور کے ان تصورات سے قطعی مختلف ہے۔ اس نے انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ جنسی جذبہ کو اہمیت دی ہے۔ وہ نہ اسے دبانے اور کچلنے کا قائل ہے، نہ انسان کو بے مہار چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی تسکین کے لیے جو طریقہ چاہے اختیار کرے، بلکہ وہ اسے ایک مخصوص طریقہ کا پابند کرتا ہے، جس کا نام 'نکاح' ہے۔ اس کے ذریعہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق صحیح بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور خاندان کا ادارہ تشکیل پاتا ہے۔ اس کی نظر میں زنا صرف وہی نہیں، جس میں جبر و اکراہ شامل ہو، بلکہ وہ بھی ہے جو طرفین کی رضامندی سے

ہوا ہو۔ نکاح کے بغیر جنسی تعلق قائم کرنا ہر حال میں حرام ہے، خواہ اس کا ارتکاب سماج کی نگاہوں کے سامنے ہو یا پوشیدہ اور اس میں طرفین کی مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔ اس کے نزدیک ہم جنس پرستی شدید مبغوض شئے اور موجبِ تعزیر جرم ہے، اس لیے کہ یہ انسان کے فطری داعیہ کے خلاف اور اس سے بغاوت ہے۔ اس کے نزدیک انسان اپنے اعضائے جسم کا مالک نہیں، بلکہ امین ہے، اس لیے مادۂ منویہ کو اسپرم بینک میں محفوظ کرنے اور رحم کو کرایے پر دینے کا اسے کوئی حق نہیں۔ اس کے نزدیک 'عفت وعصمت' اعلیٰ اخلاقی قدر اور بڑی قیمتی شئ ہے، اس لیے اس سے کھلواڑ کرنے، اسے ذریعۂ معاش بنانے یا اسے مال تجارت کی حیثیت دینے کا کسی کو حق نہیں۔ اس کے نزدیک اولاد شادی شدہ جوڑے کے لیے اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے، اس لیے رحم مادر میں پرورش پانے والا جنین لڑکا ہو یا لڑکی، دونوں یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ اللہ نے روزی اور وسائل معاش فراہم کرنے کا ذمہ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے، اس لیے کم افادیت یا عدمِ افادیت کے بہانے مادہ (Female) جنین کا اسقاط کروانا جائز نہیں۔ اس کے نزدیک بوڑھے والدین خاندان کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کی ہر طرح سے خدمت کرنا، ان کے لیے دیدہ ودل کو فرشِ راہ کرنا اور ان کی تنک مزاجی کو برداشت کرنا سعادت مند اولاد کا فریضہ ہے۔ وہ نظام خاندان میں مرد اور عورت کے حقوق کے درمیان مساوات کا تو قائل ہے، لیکن ان کی یکسانیت کا قائل نہیں ہے۔ اس نے دونوں کے دائرۂ کار الگ الگ رکھے ہیں اور دونوں کو الگ الگ نوعیت کی ذمہ داریاں سونپی ہیں۔

خاندان اور سماج کی صحیح خطوط پر استواری کے لیے اسلام نے جو تعلیمات دی ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو وہ مسائل پیدا ہی نہیں ہوں گے، جن کا اوپر کی سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ اللہ رب العالمین انسانوں کی ضروریات سے بھی واقف ہے اور ان کی فطرت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہے، جس پر اس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب انسان اپنی فطرت سے بغاوت کرتے ہیں اور اس سے انحراف کر کے غلط راہوں پر جا پڑتے ہیں۔ اسلام کی یہ تعلیمات محض خیالی اور نظریاتی

نہیں ہیں، بلکہ ایک عرصہ تک دنیا کے قابل لحاظ حصہ میں نافذ رہی ہیں اور سماج پر ان کے بہت خوش گوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اور اب بھی جن معاشروں میں ان پر عمل کیا جارہا ہے وہ پاکیزگی، امن اور باہمی ہم دردی و رحم دلی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اس لیے جو لوگ بھی موجودہ دور کے مذکورہ بالا سماجی مسائل سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ان کے برے اثرات اور پیچیدہ عواقب سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں، انھیں اسلام کی ان تعلیمات کو اختیار کرنے اور انھیں اپنے سماج میں نافذ کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے۔

☆☆☆

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی چند اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۲	مشترکہ خاندانی نظام اور نظریہ اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۴۰
۳	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۴	آزادئ فکر ونظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۵	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۶	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۵۰
۷	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲۲۴	۵۰
۸	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۶۴	۵۵
۹	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۰	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

حضرت مجدّدِ الفِ ثانیؒ اور احیائے سنت

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

امت کی تاریخ کے ہر دور میں کچھ ایسی شخصیات گزری ہیں جنھوں نے دین کے احیاء وتجدید، معاشرہ کی اصلاح اور اعلائے کلمۃ اللہ کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور ان کے گہرے اثرات سماج کے ہر طبقہ میں محسوس کیے گئے ہیں۔ ایسی ہی ایک اہم شخصیت شیخ احمد بن عبدالاحد سرہندی (م۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) کی ہے، جنھوں نے گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہندوستان کے پر آشوب دور میں اہم اور نمایاں تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے کام کو اس قدر شہرت ملی کہ ان کا لقب 'مجدد الف ثانی' ان کے اصل نام پر غالب آ گیا۔

سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہندوستان میں مغل شہنشاہ اکبر کے ایجاد کردہ 'دینِ الٰہی' کی فتنہ سامانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ شاہی سرپرستی میں اس کا تسلسل اکبر کے جانشیں جہاں گیر کے دور میں بھی جاری رہا۔ مجدّد الف ثانی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ درباری حلقوں، فوج اور امراء اور سربرآوردہ طبقہ میں اپنی اصلاحی مساعی جاری رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ فتنہ اپنی موت آپ مر گیا اور عوام کے ساتھ حکم رانوں کی بھی اصلاح ہوئی۔

اس مقالہ میں شیخ احمد سرہندی کی تجدیدی خدمات کے ایک خاص پہلو (احیائے سنت اور ردِّ بدعات) پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (معاون مدیر)

حضرت مجدّد الف ثانیؒ - مختصر سوانح

حضرت مجدّدؒ کا نام نامی احمد، لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ والد کا نام عبدالاحد تھا۔ آپ حنفی المذہب اور نقشبندی سلسلۂ طریقت وتصوف کے امام تھے، جو تمام

سلاسلِ تصوف کا جامع ہے۔ آپؒ کا سلسلۂ نسب ستائیس واسطوں سے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔ آپ کی ولادت شبِ جمعہ ۱۴؍شوال المکرّم ۹۷۱ھ مطابق ۲۶ جون ۱۵۵۴ء کو سرہند میں ہوئی۔ سنۂ ولادت لفظِ خاشع سے برآمد ہوتا ہے۔

آپ نے بچپن میں تھوڑے ہی عرصے میں قرآن کریم حفظ کرلیا، بعد ازاں اپنے والد ماجد سے تحصیلِ علوم میں مشغول ہوگئے۔ ان کی توجہ سے آپ کو علومِ متداولہ پر اس قدر عبور حاصل ہوا کہ بڑے بڑے دقیق مسائل اور ادق عبارتوں کو بہ سہولت حل فرمادیا کرتے تھے۔ علومِ متداولہ میں والد ماجد کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں مولانا کمال الدین کشمیری، شیخ یعقوب کشمیری، قاضی بہلول بدخشانی جیسے علوم وفنون کے آفتاب و ماہتاب شامل ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ مسندِ تدریس پر متمکن ہوئے۔ مختلف ممالک سے سیکڑوں طلبا کا آپ کی جانب رجوع ہونے لگا۔ رات دن درس وتدریس کا حلقہ بجتا اور حدیث وتفسیر کا مشغلہ جاری رہتا تھا۔ اس دوران آپ کی درس گاہِ تعلیم وتربیت سے کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔

اسی دوران آپ کو اکبرآباد کے علماء وفضلاء کی شہرت کا علم ہوا۔ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ چند ہی روز میں وہاں آپ کی ایسی شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے علماء حدیث وتفسیر کی سند آپ سے حاصل کرنے میں اپنی سعادت سمجھنے اور آپ سے شرفِ تلمذ کو باعثِ فخر جاننے لگے۔ اس دوران آپ کی خدمت میں بہت سے علماء وفضلاء حاضر ہوئے اور اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کی شہرت سن کر اور آپ کے علم وفضل سے متاثر ہوکر ابوالفضل اور فیضی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حد درجہ اخلاص کا اظہار کیا۔

اسی زمانے میں فیضی نے اپنی مشہورِ عالم بے نقط تفسیر 'سواطع الالہام' لکھنی شروع کی تھی۔ ایک مقام پر پہنچ کر وہ عاجز ہوگیا۔ بہت سے علماء سے مشورہ کیا، مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ مجبور ہوکر حضرت مجدد الف ثانیؒ سے درخواست کی۔ آپ کو اگرچہ اس سے قبل اس طرز کی عبارت لکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا، مگر اس کی درخواست پر اس مقام کے مناسب ایک صفحہ نہایت فصیح وبلیغ بے نقط عبارت میں تحریر فرمایا۔

۱۰۰۱ھ کے لگ بھگ ایران میں شاہ عباس صفوی حکم راں تھا۔ اس نے لوگوں کو جبراً شیعہ بنانے کی مہم شروع کی تھی۔ عبدالمومن خان ازبک والیٔ توران سے، جو نہایت نیک اور صحیح العقیدہ مسلم حکم ران تھا، اس کی اسی بنا پر جنگ ہوئی اور شاہ عباس صفوی کو شکست اٹھانی پڑی۔ ان حالات میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک رسالہ 'ردِّ روافض' تحریر کیا۔ اندازہ ہے کہ یہ ۱۰۰۲ھ میں تحریر ہوا تھا۔ اس رسالے کا نام اکثر کتابوں میں 'ردِّ مذہبِ شیعہ' یا 'ردِّ روافض' آتا ہے۔ اس کا تاریخی نام 'کوائفِ شیعہ' ہے۔ اس سے قبل غالباً ۹۹۴ھ میں آپ ایک رسالہ 'اثبات النبوۃ' کے نام سے تحریر فرما چکے تھے۔ پھر ۱۰۰۸ھ میں آپ نے رسالہ تہلیلیہ تحریر فرمایا۔ کچھ عرصہ آپ کا قیام اکبرآباد میں رہا، پھر آپ کے والد آپ کو اپنے ساتھ واپس سرہند لے گئے۔ اسی اثناء میں جب آپ کا گزر شہر تھانیسر سے ہوا تو وہاں کے رئیس سلطان نے آپ کو نہایت اعزاز و اکرام سے اپنا مہمان بنالیا اور اپنی نیک فطرت صاحب زادی کا عقد آپ سے فرمادیا۔ اندازہ ہے کہ یہ تقریب ۹۹۸ھ میں انجام پائی۔

اکبرآباد سے واپسی اور شادی کے بعد حضرت مجدد اپنے والد ماجد کی خدمت اور ان سے اکتسابِ فیض میں مشغول ہوگئے۔ جب ان کی رحلت کا وقت آیا تو انھوں نے حضرت مجدد کو سلسلۂ سہروردیہ و چشتیہ و قادریہ میں خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور اپنا جانشین نام زد کردیا۔

۱۰۰۷ھ میں آپ کے تیسرے صاحب زادے اور جانشین خواجہ محمد معصوم کی ولادت ہوئی۔ اسی دوران آپ کی مولانا حسن کشمیری سے ملاقات ہوئی، جو آپ کے پرانے احباب میں سے اور حضرت باقی باللہؒ کے مخلصین میں شامل تھے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے مناقب بیان کیے اور کہا کہ اس وقت سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں آپ جیسا کوئی اور بزرگ صوفی نظر نہیں آتا۔ آپ نے ان کے ہم راہ خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا۔ حاضری کے وقت خواجہ باقی باللہ آپ کے ساتھ نہایت مہربانی اور شفقت سے پیش آئے اور آپ کی بلند استعداد اور اعلیٰ قابلیت ملاحظہ فرما کر آپ کو اپنے پاس ٹھہرنے کی پیش کش کی۔ آپ نے وہاں قیام کا ارادہ فرمالیا۔ یہ قیام ڈھائی ماہ تک

رہا۔ اس دوران آپ حضرت خواجہ سے بیعت ہوئے اور توجہاتِ عالیہ سے مشرف ہوکر تھوڑے ہی عرصے میں تمام مقاماتِ بلند سے سرفراز فرمادیے گئے۔ آپ کو حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا اس قدر اعتماد حاصل ہوا کہ انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں، جسے ایک دوست کے نام تحریر فرمایا تھا، اپنے اس مریدِ خاص کی بابت یہ بلند مرتبہ رائے ظاہر فرمائی:

''اہلِ سرہند سے ایک بزرگ شیخ احمد بڑے عالم فاضل ہیں، جو کہ قوتِ عمل سے متصف ہیں، فقیر نے چند روز ان کی صحبت میں نشست و برخاست کرکے بہت سے عجائب روزگار کا مشاہدہ کیا۔ وہ ایک چراغ ہیں جو بہت عالم کو منور کریں گے۔''

خواجہ باقی باللہؒ نے جب حضرت مجددؒ کو ہر اعتبار سے کامل پایا تو نسبت خاصہ عطا کرکے آپ کو خلافت و اجازتِ کاملہ سے سرفراز فرمایا اور ماہِ رجب ۱۰۰۸ھ میں آپ کو واپس سرہند جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ آپ واپس تشریف لاکر طالبین کی تربیت اور سالکین کی ہدایت میں مشغول ہوگئے اور قلیل مدت میں ہزاروں طالبانِ حق اس چشمۂ فیوض سے سیراب ہوئے۔

حضرت مجددؒ کے کارِ تجدید کا آغاز اصحابِ علم کی تصریحات کے مطابق ۱۰۱۱ھ سے ہوا۔ اس کے دوسرے سال خواجہ باقی باللہؒ کا دہلی میں وصال ہوگیا۔ اس سانحے نے آپ کو رنجیدۂ خاطر کردیا۔ آپ دہلی جانے کے لیے عازم سفر ہوئے۔ وہاں پہنچ کر مزار کی زیارت کی، مخدوم زادوں اور متعلقین سے تعزیت اور انھیں صبر کی تلقین کی، پھر چند روز دہلی میں قیام فرما کر واپس سرہند تشریف لے آئے۔ اس کے بعد آپ نے ۲۳ سال تک احیائے سنت، ازالۂ بدعت اور مسلمانوں کے رشد و ہدایت کے فرائض انجام دیے۔ بالآخر یہ آفتابِ ہدایت، جس کی ضیا پاش کرنوں سے ہزاروں افراد نے براہ راست اکتسابِ فیض کیا اور لاکھوں کروڑوں افراد آج تک بالواسطہ مستفیض ہورہے ہیں، بروز منگل، ۲۸ر صفر ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۰ر دسمبر ۱۶۲۴ء بوقتِ چاشت غروب ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مکتوبات

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا معرکہ آرا کارنامہ آپ کے مکتوبات ہیں۔ ان کی

مجموعی تعداد پانچ سو چھتیس ہے۔ آپ نے اصلاح و تربیت کا جو حیرت انگیز انقلاب برپا کیا اور تجدید دین کا جو فریضہ انجام دیا، اس میں آپ کی دو خصوصیات کا اہم کردار ہے۔ ایک آپ کی بے مثال قوتِ عمل ہے، دوسرے آپ کے مکتوبات ہیں۔ یہ مکتوبات نہ صرف تصوف بلکہ علوم و معارف اور نکات و اسرار کے عالم گیر ذخیرے میں خاص امتیاز رکھتے ہیں اور اپنی تاثیر، ادب و قوتِ انشا، زورِ عبارت و سلاستِ بیان، برجستگی و روانیٔ عبارت کے اعتبار سے فارسی ادب میں بھی نہایت بلند پایہ اور انفرادی شان کے حامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے جہاں مختلف موضوعات پر حضرت مجددؒ کے خیالاتِ عالیہ سامنے آتے ہیں وہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عقائدِ حقّہ، شریعت و طریقت، اخلاق و معرفت، سنت و بدعت اور سیاست و معاشرت پر آپ کی کس قدر گہری نظر تھی اور آپ نے اسلامی علوم و معارف کا کس قدر دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

یہ مکاتیب تین دفتروں (حصوں) پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصے میں تین سو تیرہ مکاتیب ہیں۔ اسے آپ کے خلیفہ مولانا یار محمد بدخشی طالقانیؒ نے ترتیب دیا ہے۔ اس کی تاریخ اختتام 'دارالمعرفت' ہے۔ دوسرا حصہ ننانوے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اسے آپؒ کے خلیفہ مولانا عبدالحئ حصاری شادمانیؒ نے مرتب فرمایا۔ اس کا تاریخی نام 'نور الخلائق' تجویز ہوا۔ تیسرا حصہ ایک سو چودہ مکاتیب پر مشتمل اور آپؒ کے خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمیؒ کا ترتیب کردہ ہے۔ اس کا تاریخی نام 'معرفت الخلائق' ہے۔ بعد میں اس میں مزید دس مکاتیب کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح اب یہ حصہ ایک سو چوبیس مکاتیب پر مشتمل ہے۔[۱]

عہدِ مجدّدی کے مذہبی حالات

اس میں شک نہیں کہ سنت کا احیاء کرنے اور مخلوقِ خدا کو شریعت پر گام زن کرنے کے لیے، نیز اس راستے میں وقتاً فوقتاً در آنے والی خامیوں اور کم زوریوں کو دور کرنے کے لیے مسلمان مفکرین، علماء اور مشائخ کی مساعی اپنے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق ہر دور میں جاری رہی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اسلام بہ حمد اللہ آج اپنی اسی شکل

میں باقی اور موجود ہے، جس شکل میں نبی عربی ﷺ لے کر تشریف لائے تھے۔ مگر حضرت مجدد الف ثانیؒ کا کارنامہ محض نفاذ شریعت اور احیائے سنت نہیں، بلکہ اس سے کہیں بڑا ہے۔ اس کا صحیح ادراک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سنت اور شریعت کے حوالے سے اس عہد کے حالات کا جائزہ لیا جائے۔ چوں کہ ہمارا اصل موضوع حضرت حضرت مجددؒ کی تحریک کے ایک خاص پہلو احیائے سنّت اور ردِّ بدعت کا جائزہ لینا ہے، اس بنا پر ہم اس عہد کے حالات کی طرف محض اشارے کریں گے، تاکہ آج کا طالب علم اس عہد میں ان کی مساعی کو صحیح تناظر میں دیکھ سکے اور ان کی وقیع خدمات کا صحیح معنیٰ میں ادراک کر سکے۔

اس مقصد کے لیے ہم یہاں چند حوالے آئینِ اکبری سے پیش کریں گے۔ یاد رہے کہ اس عہد کے احوال و آثار پر سب سے اہم دستاویز اس عہد کے ایک عینی شاہد اور اس دور کے حالات و واقعات کے ایک اہم کردار ملا عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' ہے، مگر چوں کہ ملا عبدالقادر بدایونی اکبر اور اس کی لادینیت کے سخت ناقد ہیں، اس لیے آج کے بعض مؤرخین اور ان کی تحریروں سے متاثر بعض صحیح الفکر اہل قلم منتخب التواریخ کے بعض بیانات کی ثقاہت پر حرف گیری کرتے ہیں۔ یہ ایک علیٰحدہ موضوع ہے کہ ان کے یہ 'تحفظات' کس قدر درست ہیں، مگر ہمارے یہ اہل قلم اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ خود حضرت مجددؒ کے مکاتیب بھی منتخب التواریخ کے بیانات کی شہادت دیتے ہیں۔ ان دونوں کے بیانات کو سردست ہم زیر بحث لائے بغیر محض چند اشارے آئینِ اکبری سے کرتے ہیں، جس کی حیثیت 'اعتراف' کی سی ہے کہ وہ ابوالفضل کی تالیف ہے، جسے اکبر کے عقلِ کل اور نفسِ ناطقہ کی حیثیت حاصل تھی:

> ''فرماتے ہیں کہ ظاہری مراسم جن کو نو آئین الٰہی کہتے ہیں، یہ غافل افراد کی بیداری کے لیے ہے، وگرنہ خداوند کریم کی ثنا و عبادت دل سے ادا ہو سکتی ہے نہ کہ جسم سے۔[۲]
>
> فرماتے ہیں کہ پیروی میں درد دل کی شناخت کرنا اور لوگوں کی حاجت روائی کرنا ہے نہ کہ صرف ڈاڑھی کا بڑھا لینا اور خرقہ کپڑے کے ٹکڑوں سے تیار کرنا اور

واعظانہ ہیئت میں نمودار ہو کر ہنگامہ آرائی کرنا۔۳

فرماتے ہیں کہ کاش علوم رسمی کے ماہرین کے اس قدر اختلافات گوش زد نہ ہوتے اور ان کے اختلافات وتغیرات سے تفاسیر واحادیث اس قدر مقام تعجب نہ بن جاتے۔۴

فرماتے ہیں کہ جو شخص خلوص اور قلبی صفائی کے ساتھ میرے قوانین کو قبول کر لے تو وہ بالیقین ظاہری و باطنی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگا۔۵

فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے حال پر ایک خاص عنایت ہے۔ اسی وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت خیال کی جاتی ہے، لیکن کوتاہ بین شخص بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔۶

عوام کس لیے سیہ دل دولت مندوں کی اپنے نفع کی غرض سے عزت کرتے ہیں اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس چشمۂ نور کے احترام میں کوتاہی کرتے ہیں اور عبادت گزار پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اگر خود ان کی عقل پر آفت نہ آ گئی ہے تو سورۃ والشّمس کیوں فراموش کر دی گئی۔۷

فرمایا کہ احمد کیش میں دختر کو میراث میں کم حصہ دیا جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ دختر بوجہ اپنی کم قوتی کے زیادہ کی سزاوار ہے اور یہ امر محض اس وجہ سے ہے کہ وہ شوہر کے گھر میں جاتی ہے اور میراث بے گانہ افراد کے گھر میں پہنچ جاتی ہے۔۸

فرماتے ہیں کہ مجھے اس امر کا سخت تعجب ہے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانے میں قرآن کی تفسیر رائج نہ ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کے مفہوم و مطالب میں اختلاف نہ پیدا ہوتا۔۹

فرماتے ہیں کہ قدماء کا قول ہے کہ سخت ترین بلیّات پیمبروں پر نازل ہوئیں اور اس کے بعد اولیاء پر اور اسی صورت سے درجہ بہ درجہ جملہ صالحین پر۔ مجھے اس امر کا یقین نہیں ہوتا کہ ان مقبولانِ بارگاہِ ایزدی پر کیوں اس قدر بلیّات نازل کی گئیں۔ علمائے ظاہر کی ایک جماعت نے عرض کیا کہ یہ محض خدا کی آزمائش تھی۔ جہاں پناہ اس سے بے حد متعجب ہوئے اور فرمایا کہ آزمائش دانائے پوشیدہ و

آشکارا کے لیے کیوں کر مناسب خیال کی جاسکتی ہے۔۱۰؎

فرماتے ہیں کہ لوگ اپنے فرزندوں کے نام صالحین کے نام پر رکھے دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر حصول برکت کی غرض سے ظہور میں آتا ہے، مگر دراصل ادب سے دؤر ہے۔ تعجب خیر امر یہ ہے کہ جو لوگ تناسخ کے قائل نہیں ہیں وہ اس امر کے زیادہ ترکوشاں ہیں اور اہل ہند جو تناسخ کے قائل ہیں وہ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔۱۱؎

فرماتے ہیں کہ اگر سور کی حرمت کا باعث اس کی بے عزتی ہے تو لازم ہے کہ شیر یا مثل اس کے دوسرے جانور حلال ہوں۔۱۲؎

فرماتے ہیں کہ مجھے انسان کے اس فعل پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ خردسال لڑکوں سے، جو فرائض کے بارے میں سبک دوش ہیں، ختنہ کی سنت کو لازمی جانتے ہیں۔۱۳؎

فرماتے ہیں کہ قدیم کتب سماوی میں مرقوم ہے کہ گناہ گارانِ سلف کی صورتیں بندر اور سور کی شکلوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ یہ بھی ایک نادر الوجود اور تعجب خیر امر ہے۔۱۴؎

فرماتے ہیں کہ انسان اپنے معدے کو جانوروں کا قبرستان بنائے، یہ فعل نامناسب ہے۔۱۵؎

فرماتے ہیں کہ جب کہ باز کی خوراک بہ جز جانوروں کے گوشت کے دوسری نہیں ہے یہی سبب ہے کہ اس کی کمر عمری اس کی گوشت خوری کی مکافات ہے۔ انسان جو اپنی بے شمار خورش کی موجودگی کے باوجود گوشت کے کھانے سے پرہیز نہیں کرتا، آخر کار اس کا کیا حال ہوگا۔۱۶؎

فرماتے ہیں کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ ہر سال ماہِ ولادت میں گوشت نہ کھائے، تاکہ خدا کی عبادت ادا ہو اور سال عمدگی سے گزر جائے۔۱۷؎

فرماتے ہیں کہ قصاب اور ماہی گیر اور مثل ان کے دیگر اشخاص، جن کا پیشہ جاں شکنی ہے، ان کی جماعت کو عام آبادی سے علیٰحدہ کر دیا جائے اور ان سے ملنے والوں سے تاوان وصول کیا جائے۔۱۸؎

فرماتے ہیں کہ سلاطین کے دیدار کو لوگ خدا کی پرستش جانتے ہیں اور اس کو تمامی مخلوق ظل اللہ جانتی ہے۔ ان وجوہ سے بالیقین اس کا دیدار خدا کی عبادت کا

سرمایہ ہے اور سائے کو اس کے مالک سے جدا نہ خیال کرنا چاہیے۔[۱۹]

میرا خیال ہے کہ یہ چند اشارے اس عہد کی تصویر کشی کے لیے کافی ہیں۔ غور کیا جائے تو 'دینِ الٰہی' کی وہ تمام تفاصیل، جو ملا عبدالقادر بدایونی نے بیان کی ہیں، آئینِ اکبری میں بھی موجود ہیں۔

اختصار کی غرض سے یہاں صرف 'می فرمودن' سے چند اقتباسات درج کیے گئے ہیں۔ مزید مطالعے کے لیے آئین اکبری کے دوسرے اہم ترین باب 'آئین راہ نمونی' سے رجوع کرنا مناسب ہوگا۔

حضرت مجدّد کی فکر مندی

ان حالات کا حضرت مجدّدؒ کو کس شدت سے احساس تھا، اس کی چند جھلکیاں دکھانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، تاکہ ہم ان کی خدمات کی اہمیت اور حالات کی سنگینی کا احساس کر سکیں۔ ایک مکتوب میں اپنے عہد کے حالات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اسلام کی غربت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کافر کھلّم کھلا اسلام پر طعن اور مسلمانوں کی مذمّت کرتے ہیں، بے خوف و خطر ہر کوچے و بازار میں کفر کے احکام جاری اور اہلِ کفر کی تعریف کرتے ہیں اور مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے روک دیے گئے ہیں، اور شریعت کے احکام بجالانے کی صورت میں ان کی مذمت اور ان پر طعنہ زنی کی جاتی ہے۔ بیت:
>
> پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
> بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست
>
> پری تو رُخ کو چھپائے ہے دیو ناز کرے
> یہ حال دیکھ کے حیرت سے ہوش جاتے رہے
>
> **سبحان اللہ وبحمدہ** (اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اس کی تعریف ہے) عقل مندوں نے کہا ہے کہ **الشرع تحت السیف** (شریعت تلوار کے نیچے ہے) اور

شرع شریف کی رونق بادشاہوں کے ساتھ وابستہ ہے (اور اب) قضیہ برعکس ہوگیا ہے اور معاملہ بدل گیا ہے۔ ہائے افسوس صد افسوس!!''[۲۰]

اور اس کے بعد کے زمانے میں لکھے گئے ایک مکتوب میں حضرت مجددؒ فرماتے ہیں:

''آپ جانتے ہیں کہ گزشتہ صدی میں اہلِ اسلام کے سر پر کیا کیا (مصیبتیں) گزری ہیں۔ گزشتہ صدیوں (یعنی ابتدائے اسلام) میں نہایت قلت وغربت کے باوجود اہلِ اسلام کی خرابی وتباہی بھی اس سے زیادہ نہیں ہوئی تھی کہ مسلمان اپنے دین پر اور کفار اپنے طریقے پر قائم تھے۔ آیت کریمہ **لکم دینکم ولی دین** (الکٰفرون:۶) (تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین) میں اسی حقیقت کا بیان ہے اور گزشتہ صدی میں کفار غلبہ پاکر دارِ اسلام میں کھلّم کھلا کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان اسلامی احکام کے جاری کرنے سے عاجز تھے اور اگر وہ (ایسا) کرتے تھے تو قتل کردیے جاتے تھے۔ ہائے ہلاکت، ہائے مصیبت، ہائے افسوس اور غم! حق تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے والے تو ذلیل وخوار تھے اور آپ کے منکر لوگ عزت والے اور معتبر تھے۔ مسلمان زخمی دلوں کے ساتھ اسلام کی ماتم پُرسی کرتے تھے اور مخالف دشمن ہنسی مذاق کے ساتھ اُن کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے۔ ہدایت کا آفتاب گم راہی کے پردہ میں چھپا ہوا تھا اور حقانیت کا نور باطل کے پردوں میں گوشہ گیر ہوگیا تھا۔''[۲۱]

بدعات کا رد

بدعات کا ذکر کرتے ہوئے ایک مکتوب میں مخدوم زادہ خواجہ محمد عبداللہ کو اپنے عہد میں بدعات کی فراوانی اور اس صورت حال پر اپنے اضطراب کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''اسلام اس زمانے میں غریب (یعنی بے یار ومددگار) ہوگیا ہے اور مسلمان بھی بے یار ومددگار ہوتے جارہے ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اور بھی زیادہ

غریب و بے کس ہوتے جائیں گے، حتیٰ کہ زمین پر اللہ اللہ کہنے والا کوئی نہ رہے گا **وتقوم الساعة علی شرار الناس** (اور قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوجائے گی) سعادت مند وہ شخص ہے جو اس غربت کے زمانے میں ترک شدہ سنتوں میں سے کسی سنت کو زندہ کرے اور مروّجہ و معمولہ بدعتوں میں سے کسی بدعت کو ختم کردے۔ یہ وہ وقت ہے کہ حضرت خیر البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کو ہزار سال گزر چکے ہیں اور قیامت کی علامتوں نے پرتو ڈالا ہوا ہے۔ (یعنی علاماتِ قیامت ظاہر ہونا شروع ہوگئی ہیں) اور عہدِ نبوت سے دور ہونے کے باعث سنت پوشیدہ ہوگئی ہے اور کذب و جھوٹ پھیل جانے کی وجہ سے بدعت جلوہ گر ہورہی ہے۔ اب ایک ایسے شاہ باز جواں مرد کی ضرورت ہے جو سنت کی مدد کرے اور بدعت کو شکست دے۔ بدعت کا جاری کرنا دین کی بربادی کا موجب ہے اور بدعتی کی تعظیم کرنا اسلام کو مٹانے کا باعث ہے۔ (آں حضرت ﷺ کا یہ فرمان) آپ نے سنا ہوگا **مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ الْبِدْعَةِ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰی هَدْمِ الْاِسْلَامِ** (جس نے کسی بدعتی کی تعظیم کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد کی) لہٰذا پورے ارادے اور کامل ہمت سے اس طرف متوجہ ہونا چاہیے کہ سنتوں میں سے کوئی سنت جاری ہوجائے اور بدعتوں میں سے کوئی بدعت دور ہوجائے۔ ہر زمانے میں اور خصوصاً اس ضعفِ اسلام کے زمانے میں احکام اسلام کو قائم کرنا سنت کو رواج دینے اور بدعت کی تخریب کرنے پر وابستہ ہے۔ گزشتہ زمانے کے لوگوں نے شاید کسی بدعت میں کوئی حسن دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے بعض افرادِ بدعت کو انھوں نے مستحسن قرار دیا ہے۔ لیکن یہ فقیر اس مسئلے میں ان کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا اور بدعت کے کسی فرد کو حسنہ نہیں جانتا۔ بلکہ سوائے ظلمت و کدورت کے اس میں کچھ محسوس نہیں کرتا۔ آں حضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ **کل بدعة ضلالة** (ہر بدعت گم راہی ہے) اسلام کے اس غربت وضعف کے زمانے میں جب کہ سلامتی سنت کے بجالانے پر موقوف ہے

اور خرابی بدعت کے ارتکاب میں ہے، خواہ کوئی بھی بدعت ہو، ہر بدعت کو پھاوڑے کی طرح جانتا ہے جو بنیادِ اسلام کو گراتی ہے۔ اور سنت کو اس روشن ستارے کی طرح دیکھتا ہے جو گم راہی کی تاریک رات میں ہدایت کا باعث بنتا ہے۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ علمائے وقت کو توفیق دے کہ کسی بدعت کو حَسَن کہنے کی جرأت نہ کریں اور کسی بدعت پر عمل کرنے کا فتویٰ نہ دیں، اگرچہ وہ بدعت ان کی نظروں میں صبح کی سفیدی کی طرح ہی روشن ہو، کیوں کہ سنت کے ماسوا میں شیطان کے مکر وفریب کو بڑا غلبہ ودخل ہوتا ہے۔ گزشتہ زمانے میں جب کہ اسلام قوی تھا اس لیے بدعت کی ظلمات کو برداشت کرسکتا تھا۔ اس وقت شاید نور اسلام کی روشنی میں بعض بدعتوں کی ظلمات بعض اشخاص کو نورانی معلوم ہوتی ہوں، جس کی وجہ سے ان پر حسنہ کا حکم لگایا ہو، اگرچہ درحقیقت ان میں کسی قسم کا حسن اور نورانیت نہیں تھی۔ مگر اس وقت، جب کہ اسلام ضعیف ہے، بدعتوں کی ظلمتوں کو برداشت کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ اس وقت متقدمین اور متاخرین کا فتویٰ جاری نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ ہر وقت کے احکام علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتے ہیں۔ اس وقت پورا عالم ظہور بدعت کی کثرت کی وجہ سے بحرِ ظلمات کی طرح نظر آرہا ہے اور سنت کا نور اپنی غربت وقلت کے باعث اس بحرِ ظلمات میں کرم ہائے شب افروز (جگنوؤں کی طرح) محسوس ہورہا ہے اور بدعت کا عمل اس ظلمت میں اور اضافہ کررہا ہے اور سنت کے نور کو کم کرتا جاتا ہے۔ سنت پر عمل کرنا ظلمت کو کم کرنے اور نورانیت کو زیادہ کرنے کا باعث ہے''۔۲۲

حقیقت یہی ہے کہ بدعات کا معاملہ واقعتاً بڑا سنگین اور ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ درحقیقت ایک بدعت کا آغاز ایک سنت کا اختتام ہے اور ایک بدعت کی ترویج ایک روایتِ سنت کا انہدام ہے، جب کہ سنت نورِ نبوت ہے، جس سے جہانِ شریعت روشن اور منوّر رہے، اس کے برعکس بدعت وہ فکری وعملی گم راہی ہے جس سے ظلمتوں کے سوا کسی اور چیز کا کشید کرنا ممکن نہیں۔ حضرت مجددؒ نے ان حقائق کی جانب جا بہ جا متوجہ فرمایا ہے،

اور اس سلسلے میں اپنے مکتوبات میں بے شمار مقامات پر پوری جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ایک مکتوب میں بدعت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ہماری نصیحت بس یہی ہے کہ احکامِ دین بجالائیں اور حضرت سید المرسلین علیہ وعلیٰ آلہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی متابعت اختیار کریں۔ سنتِ سنیّہ کو بجالائیں اور بدعتِ نامرضیہ سے پرہیز کریں۔ اگرچہ بدعت صبح کی سفیدی کے مانند روشن ہو، لیکن حقیقت میں اس میں کوئی روشنی اور نور نہیں اور نہ ہی کسی بیمار کے لیے اس میں شفا ہے اور نہ ہی کسی مرض کی اس میں دوا ہے۔ اور یہ بات اس میں کیسے ہوسکتی ہے جب کہ بدعت دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو وہ سنت کو دفع کرنے والی ہوگی یا رفع سنت سے ساکت ہوگی۔ ساکت ہونے کی صورت میں وہ بالضرور سنت پر ایک زائد چیز ہوگی، جو درحقیقت اس (سنت) کو منسوخ کرنے والی ہوگی، کیوں کہ نص پر زیادتی نص کی ناسخ ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بدعت خواہ کسی قسم کی ہو، سنت کو دفع کرنے والی اور اس کی نقیض ہوتی ہے اور اس میں کسی قسم کا خیر اور کوئی حسن نہیں ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوجاتا کہ انھوں نے دین کامل اور اسلام پسندیدہ میں، جب کہ نعمت مکمل ہوچکی، بدعت محدثہ کے حسن ہونے کا حکم کس طرح دیا؟ یہ نہیں جانتے کہ کمالِ دین اور اتمام رضا کے حاصل ہونے کے بعد دین میں بدعت (کوئی نیا کام) پیدا کرنا حَسَن سے کوسوں دور ہے۔ **فماذا بعد الحق الا الضلال** (یونس:۳۲) (حق کے بعد گم راہی کے سوا کیا ہے)۔ اگر یہ لوگ (اہل بدعت) جانتے کہ دین کامل میں امور محدثہ (نئے کام) کو حَسَن کہنا دین کے کامل نہ ہونے کو لازم آتا ہے اور نعمت کے ناتمام ہونے پر دلالت کرتا ہے تو ہرگز اس قسم کی باتوں کی جرأت نہ کرتے''۔۲۳

بدعت کے ضمن میں ایک مغالطہ یہ عام ہے کہ بدعات کی دو قسمیں ہیں: بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ۔ یہ تقسیم بہ جائے خود ایک ایسی گم راہی ہے جو مزید گم راہیوں کے جنم لینے کا باعث بنتی ہے۔ حضرت مجددؒ بدعت کی اس تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے، بلکہ

بالکلیہ اسے سختی کے ساتھ رد کرتے ہیں، جیسا کہ سطور بالا میں مذکور طویل اقتباس میں تفصیل کے ساتھ یہ بحث مذکور ہے۔

ایک اور مکتوب میں واضح طور پر فرماتے ہیں کہ ہر بدعت سیئہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''بعض علماء کہتے ہیں کہ بدعت دو قسم کی ہے: حسنہ اور سیئہ (یعنی نیک اور بد)۔ بدعتِ حسنہ اس نیک عمل کو کہتے ہیں جو کہ آں حضور اور آپ کے خلفائے راشدین **علیه وعلیهم الصلوٰة اتمها ومن التحیات اکملها** کے بعد ظاہر ہوا ہو اور رافعِ سنت نہ ہو (یعنی سنت کو دؤ رکرنے والی نہ ہو)۔ اور بدعتِ سیئہ وہ ہے جو رافعِ سنت ہو (یعنی سنت کو دؤ رکرنے والی ہو) مگر یہ فقیر ان بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حُسن اور نورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا، اور سوائے ظلمت و کدورت کے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض کوئی نیا عمل (بدعت) آج اپنی ضعفِ بصارت کی وجہ سے تازہ اور خوش نما معلوم ہوتا ہے تو کل (یعنی روزِ قیامت) جب نظر تیز ہوجائے گی تو سوائے نقصان اور ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

بوقتِ صبح شود ہیچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شبِ دیجور
صبحِ محشر ، روز روشن کی طرح
رات تیری سب عیاں ہوجائے گی

حضرت سید البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات فرماتے ہیں: **من أحدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو ردّ** (جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی نئی چیز نکالی جو اس میں نہیں ہے تو وہ قابل رد ہے)۔ بھلا جو چیز کہ مردود ہو اُس میں حُسن (بھلائی) کہاں سے آئے گا۔ اور آں حضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: **اما بعد فان خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد ﷺ وشر الأمور محدثاتها وکل بدعة ضلالة** (اس کے بعد واضح ہو کہ بہترین کلام، کلام اللہ ہے، اور بہترین طریقہ و سیرت حضرت محمد

ﷺ کا طریقہ وسیرت ہے، اور بدترین چیز دین میں نئی باتیں (بدعتیں) ہیں، اور ہر بدعت گم راہی ہے)۔

نیز آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: **أوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ و إن کان عبداً حبشیاً فانہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیّین ، تمسّکوا بھا وعضّوا علیھا بالنواجذ وایّاکم ومحدثات الامورِ فان کلّ محدثۃٍ بدعۃٌ و کل بدعۃ ضلالۃٌ** (میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (اپنے حاکم کی بات) سنو اور اس کی تابع داری کرو، اگر چہ تمہارا حاکم حبشی غلام ہی کیوں نہ ہوں، کیوں کہ جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ عن قریب بہت اختلافات دیکھے گا، پس تم میری اور میرے خلفاء راشدین مہدیّین کی سنت کو لازم پکڑو، اور اس کو (ہاتھوں سے) بہت مضبوط تھامو، اور دانتوں سے پکڑو، اور نئے پیدا شدہ امور سے بچو، کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گم راہی وضلالت ہے)۔ لہٰذا جب دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گم راہی و ضلالت ہے تو پھر بدعت میں حسن (بھلائی) تلاش کرنے کے کیا معنیٰ؟! نیز احادیثِ شریفہ سے جو کچھ مفہوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر بدعت سنت کی رافع ہے، بعض کی کوئی تخصیص نہیں (یعنی یہ بدعتِ حسنہ ہے اور یہ سیئہ) لہٰذا ہر بدعت سیئہ ہے۔ حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: **ما أحدث قوم بدعۃً الا رفع مثلھا من السنۃ فتمسک بسنۃ خیر من احداث بدعۃ** (جب کوئی قوم بدعت جاری کرتی ہے تو اُس سے اس جیسی ایک سنت اٹھالی جاتی ہے، پس سنت کو مضبوط پکڑنا بدعت کے جاری کرنے سے بہتر ہے)۔ اور حضرت حسان (بن ثابتؓ) سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**ما ابتدع قوم بدعۃ فی دینھم الا نزع اللہ من سنتھم مثلھا ثم لا یعیدھا الیھم الیٰ یوم القیامۃ**" (کوئی قوم اپنے دین میں بدعت جاری نہیں کرتی، مگر اللہ تعالیٰ اس جیسی

ایک سنت ان میں سے اُٹھالیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس سنت کو قیامت تک ان کی طرف نہیں لوٹاتا)۔۲۴

ایک مکتوب میں بدعت کو ظلمت و کدورت قرار دیتے ہوئے اسے 'حسنہ' سمجھنے والوں کو قرآن کریم کے مفہوم سے لاعلم قرار دیتے ہیں۔فرماتے ہیں:

''سنتِ سنیہ (روشن و بلند سنتیں) **علی صاحبها الصلوٰة والسلام والتحية** کے نور کو بدعتوں کے اندھیروں نے پوشیدہ کردیا ہے اور ملتِ مصطفویہ **علی مصدرها الصلوٰة والسلام والتحية** کی رونق کو امورِ محدثہ (نت نئے کام) کی گندگیوں نے ضائع کردیا ہے۔ پھر اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ ان محدثات (دین میں نئی نئی باتیں) کو امورِ مستحسنہ (نیک کام) جانتے ہیں اور ان بدعتوں کو حسنہ خیال کرتے ہیں اور ان حسنات سے دین کی تکمیل اور ملت کی تتمیم (پورا ہونے) کو تلاش کرتے ہیں اور ان امور کے بجالانے کی ترغیبیں دیتے ہیں **هداهم الله سبحانه الى سواء الصراط** (اللہ سبحانہٗ ان کو سیدھے راستے کی ہدایت دے) کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ دین تو ان محدثات سے پہلے ہی کامل ہو چکا ہے اور نعمت خداوندی پوری ہوچکی ہے اور حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کی رضامندی اس سے حاصل ہوچکی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِيناً (المائدۃ:۳) (آج میں نے دین کو تمھارے لیے کامل کردیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کردیا اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا) پس ان محدثات (بدعات) سے دین کا کمال طلب کرنا حقیقت میں اس آیۂ کریمہ کے مفہوم سے انکار کرنا ہے۔۲۵

محفل میلاد

آپ نے بدعات کے بارے میں اجمالی طور پر اظہار خیال کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بہت سی بدعات کو علیٰحدہ علیٰحدہ وضاحت کے ساتھ متعین کرکے ان کو اختیار

کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں میلاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

''آپ نے 'مولود خوانی' کے بارے میں تحریر کیا تھا کہ ''خوش الحانی سے قرآن شریف پڑھنے اور نعت و منقبت کے قصائد (خوش الحانی کے ساتھ) پڑھنے میں کیا مضائقہ ہے؟ ممنوع تو یہ ہے کہ قرآن مجید کے حروف کو تبدیل و تحریف کیا جائے اور نغمے کے مقامات کی رعایت کو لازم جاننا اور الحان کے طریق پر آواز کو پھیرنا اور شعر کے مناسب تالیاں بجانا، جو شعر میں بھی غیر مباح ہیں۔ لیکن اگر اس طریقے پر پڑھا جائے کہ قرآنی کلمات میں کوئی تحریف واقع نہ ہو اور قصائد کے پڑھنے میں بھی مذکورہ شرائط محقق نہ ہوں اور اس کو صحیح مقصد کے لیے تجویز کیا جائے تو کیا ممانعت ہے؟''۔ میرے مخدوم! فقیر کے دل میں آتا ہے کہ جب تک اس دروازے کو مطلق طور پر بند نہ کریں گے اس وقت تک بوالہوس باز نہیں آئیں گے۔ اگر تھوڑا سا بھی جائز کریں گے تو بہت تک پہنچ جائے گا۔ مشہول مقولہ ہے قلیلہ یفضی الی کثیرہ (تھوڑا زیادہ کی طرف لے جاتا ہے) والسلام۔ ۲۶

نوافل کی باجماعت ادائی

نوافل کی جماعت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''جاننا چاہیے کہ اس زمانے میں اکثر خواص و عوام نوافل کے ادا کرنے میں تو بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور فرض نمازوں میں سستی کرتے ہیں اور ان (فرائض) میں سنن و مستحبات کی رعایت بھی بہت کم کرتے ہیں۔ نوافل کو عزیز جانتے ہیں اور فرائض کو ذلیل و خوار۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو فرائض کو مستحب وقتوں میں ادا کرتے ہوں، جماعتِ مسنونہ کی تکثیر (کثرت) میں بلکہ نفس جماعت کی بھی کوئی پابندی نہیں کرتے اور نفس فرائض کو غفلت و سستی کے ساتھ ادا کرنے کو غنیمت جانتے ہیں، لیکن عاشورا (دسویں محرم) کے دن اور شبِ برأت اور ماہِ رجب کی ستائیسویں شب اور ماہِ مذکور (رجب) کے اول جمعہ کی شب کو،

جس کا نام انھوں نے لیلۃ الرغائب (ماہِ رجب کی پہلی شبِ جمعہ) رکھا ہے، نہایت اہتمام کرکے نوافل کو بہت بڑی جمعیت کے ساتھ باجماعت ادا کرتے ہیں اور اس کو نیک و مستحسن خیال کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ (نوافل کو اہتمام کے ساتھ باجماعت ادا کرنا) شیطان کا مکروفریب ہے، جو کہ سیئات کو حسنات کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔.....پس اسلام کے والیوں، قاضیوں اور محتسبوں پر لازم ہے کہ اس طرح کے اجتماع سے (لوگوں کو) منع کریں اور اس بارے میں بہت ہی زجر و تنبیہ کریں، تاکہ یہ بدعت جس سے فتنہ برپا ہونے کا اندیشہ ہے، جڑ سے اکھڑ جائے۔[۲۷]

اخروی کامیابی کا مدار اتباع شریعت پر ہے

بدعات عام طور پر اسی وقت رواج پاتی ہیں جب شریعت کا علم اور اس کے تقاضوں پر عمل کم زور ہوجاتا ہے، خصوصاً اہلِ تصوف اگر علمِ دین سے کما حقہ بہرہ ور نہ ہوں تو اس خرابی کے درآنے کے زیادہ امکانات ہوجاتے ہیں۔ حضرت مجددؒ حکیم وقت تھے۔ وہ نفس کے ان چور راستوں سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ان پر تنبیہ فرمائی ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اصل جز شریعت ہے، اسی پر اخروی کامیابی کا مدار ہے جو اصل کامیابی اور مومن کا مقصود ہے اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع کے بغیر نجاتِ اخروی ممکن نہیں۔ فرماتے ہیں:

''نجات کا طریقہ اور چھٹکارے کا راستہ اعتقاد و عمل میں صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت ہے۔ استاد اور پیر کو بھی اسی غرض سے پکڑتے ہیں، تاکہ وہ شریعت کی طرف رہ نمائی کریں اور ان کی برکت سے شریعت کے اعتقاد و عمل میں آسانی اور سہولت پیدا ہو، نہ کہ مرید جو چاہیں کریں اور جو کچھ چاہیں کھائیں پیران کے لیے سپر بن جائیں اور ان کو عذاب سے بچالیں۔ یہ محض ایک دھوکہ اور آرزو ہے، کیوں کہ ایسا خیال کرنا ایک نکمّی اور بے کار آرزو ہے۔ وہاں (محشر میں) کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہ کرسکے گا اور جب

تک عمل پسندیدہ نہ ہوں گے کوئی اس کی شفاعت نہیں کرے گا اور عمل پسندیدہ اس وقت ہوں گے جب کہ شریعت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ شریعت کی متابعت کے ہوتے ہوئے اگر کوئی لغزش اور قصور اس سے سرزد ہوگا تو اس کا تدارک شفاعت سے ہو سکے گا۔'' ۲۸

ایک اور مقام پر حضرت مجددؒ نے شریعت اور تصوف کے مابین تقابل کرتے ہوئے شریعت کی حقیقت کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور تصوف سے وابستگان کے تصوف کے بارے میں غلو اور ان کی بعض غلط فہمیوں کا رد کرتے ہوئے متابعت انبیاء علیہم السلام کی جانب توجہ دلائی ہے، جو دراصل سنت پر عمل کی تاکید کے ہم معنیٰ ہے۔ فرماتے ہیں:

''کل قیامت کے روز شریعت کی بابت پوچھیں گے، تصوف کے متعلق نہیں پوچھیں گے۔ جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے بچنا شریعت کے احکام بجالانے پر منحصر ہے۔ انبیاء صلوات اللہ تعالیٰ و تسلیماتہ علیہم نے، جو کہ تمام کائنات میں سب سے بہتر ہیں، (اپنی اپنی) شریعتوں کی طرف دعوت دی ہے، اور نجات کا انحصار اسی پر رہا ہے۔ اور ان بزرگوں کی پیدائش سے مقصود شریعتوں کی تبلیغ ہے۔ پس سب سے بڑی نیکی شریعت کے رواج دینے اور اس کے حکموں میں سے کسی حکم کے زندہ کرنے میں کوشش کرنا ہے، خصوصاً ایسے زمانے میں، جب کہ اسلامی شعائر (نشانات و ارکان) بالکل مٹ گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ عزّ وجلّ کے راستے میں کروڑوں روپیہ خرچ کرنا بھی شرعی مسائل میں سے کسی ایک مسئلے کو رواج دینے کے برابر نہیں ہے۔ کیوں کہ اس فعل (شرعی مسائل کی ترویج) میں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اقتدا ہے، جو کہ مخلوقات میں سب سے زیادہ بزرگ ہیں اور اس فعل میں ان بزرگوں کے ساتھ شریک ہونا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہے کہ سب سے کامل نیکیاں انہی بزرگوں کو عطا ہوئی ہیں اور کروڑوں روپیہ خرچ کرنا تو ان بزرگوں کے علاوہ دوسروں کو بھی میسر ہے۔'' ۲۹

حضرت مجددؒ اور غیر مسلم مفکرین

احیائے سنت اور ردِّ بدعات کے سلسلے میں حضرت مجددؒ کی مساعی اور ان کی علمی اور عملی کاوشوں کا غیر مسلم مفکرین نے بھی اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر فری لینڈ ایبٹ (Dr Freeland Abbot) نے ان کے کارناموں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے:

''اس میں شک نہیں کہ شیخ احمد کے اثرات نہایت ہی شان دار تھے۔ آپ نے تبلیغ وارشاد سے، بحث ومباحثے سے اور رسل ورسائل کے ذریعے اہم امرائے مملکت کو یہ باور کرایا کہ ہندوستان میں اسلام کے اندر بہت سی بدعات داخل ہوگئی ہیں، ان کو ترک کر دینا چاہیے اور اسلام کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔''[۳۰]

جب کہ ڈاکٹر پیٹر ہارڈی حضرت مجددؒ کے تجدیدی کارناموں اور اصلاحِ احوال کے میدان میں ان کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

''شیخ احمد سرہندی کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں اسلام کو خود تصوف کے ذریعے متصوفانہ انتہا پسندی سے نجات دلائی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس نظریے کی انھوں نے تردید کی اس کے منشا ومفہوم اور قدر وقیمت کا ذاتی طور پر ان کو عمیق ادراک تھا''۔[۳۱]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تجدیدی کارناموں میں سب سے اہم نکتہ احیائے دین وسنت اور ردِّ بدعت ہے۔ آں حضرت ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کو ایک ہزار سال مکمل ہونے پر بعض کج فہم لوگوں نے نئے دین کا جو شوشہ چھوڑا تھا وہ اس قدر تیزی کے ساتھ بدعات کے فروغ اور سنت کے انہدام کا سبب بن رہا تھا کہ حضرت مجدد جیسے شخص کی مساعی اولین ضرورت سمجھی گئیں اور اسی مناسبت سے انھیں مجدد الف ثانی کے لقب سے یاد کیا گیا۔ ان کی دعوتی واصلاحی مساعی اور احیائے سنت کے باب میں ان کی تحریریں بہ جائے خود ایک کتاب کا موضوع ہیں۔

حواشی ومراجع

۱ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے: حضرت مجدد الف ثانی، مولانا سید زوار حسین شاہؒ، ادارہ مجددیہ، کراچی۔

۲ علامہ ابوالفضل، آئین اکبری، ترجمہ مولوی محمد فدا علی طالب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۷ء، ج ۲، ۳۴۶، نمبر ۱۰

۳ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۰، نمبر ۵۳

۴ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۴، نمبر ۸۵

۵ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۶، نمبر ۱۰۳

۶ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۶، نمبر ۱۰۶

۷ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۶، نمبر ۱۰۷

۸ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۷، نمبر ۱۱۱

۹ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۵۹، نمبر ۱۳۲

۱۰ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۰، نمبر ۱۳۴

۱۱ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۱، نمبر ۱۴۲

۱۲ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۱، نمبر ۱۴۳

۱۳ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۱، نمبر ۱۴۴

۱۴ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۲، نمبر ۱۵۰

۱۵ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۳، نمبر ۱۵۸

۱۶ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۵، نمبر ۱۷۲

۱۷ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۶، نمبر ۱۸۳

۱۸ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۶۶، نمبر ۱۸۴

۱۹ حوالہ بالا، ج ۲، ۳۷۰، نمبر ۲۰۴

۲۰ دفتر اول: مکتوب ۶۵، ص ۲۰۵، (دفتر اول، جلد اول) ترجمہ مولانا سید زوار حسین

شاہؒ، ادارۂ مجددیہ، کراچی، ۱۹۹۵ء۔ راقم کے اس مضمون میں مکتوبات حضرت مجددیہ کی تمام عبارتیں اسی نسخے سے ماخوذ ہیں۔

۲۱ حوالہ بالا، مکتوب ۴۷، ص ۱۷۲ (دفتر اول، جلد اول)

۲۲ دفتر دوم، مکتوب ۲۳، ص ۸۱

۲۳ حوالہ بالا، مکتوب ۱۹، ص ۷۰

۲۴ دفتر اول، مکتوب ۱۸۶، ص ۴۰ (دفتر اول، جلد دوم)

۲۵ حوالہ بالا، مکتوب ۲۶۰، ص ۲۳۶، (دفتر اول، جلد دوم)

۲۶ دفتر سوم، مکتوب ۷۲، ص ۲۰۴

۲۷ دفتر اول: مکتوب ۲۸۸، ص ۳۹۳، ۳۹۶ (دفتر اول، جلد دوم)

۲۸ دفتر سوم، مکتوب ۴۱، ص ۱۳۷

۲۹ دفتر اول: مکتوب ۴۸، ص ۱۷۵ (دفتر اول، جلد اول)

30. Dr. Freeland Abbot. "Islam in India Before Shah Waliullah" Studies In Islam. New Delhi, April, 1969

31. Wm. Theodre de Bary: Sources of Indian Traditions, New York, 1956, pp.449

☆☆☆

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

انیسویں صدی عیسوی میں
عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقا

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

جدید عربی ادب کے ایک سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ اس میں خودنوشت نگاری کے فن کو ایک معقول اور مناسب مقام ملتا جارہا ہے۔ چناں چہ اس میں دن بہ دن کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اضافہ ہورہا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس وقت ہوجاتی ہے جب ہم پیچھے مُڑکر اپنے قدیم سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد، اولاً کسی مستحکم عربی اسلامی ریاست کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اور ثانیاً علوم وفنون سے مسلم حکم رانوں کی سرپرستی ختم ہونے کی وجہ سے تمام اسلامی ، ادبی، علمی اور تحقیقی کوششوں کا دروازہ تقریباً بند ہوگیا تھا۔ البتہ تاریخ اور سیرت جیسے موضوعات پر علماء اور حکم رانوں دونوں کی توجہ کسی حد تک باقی تھی، لیکن عربی ادب عہد زوال اور عہد عثمانی میں بالکل ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ جہاں تک خودنوشت نگاری کا تعلق ہے تو یہ ادب کی انتہائی مظلوم اور متروک صنف ہوکر رہ گئی تھی۔ [۱]

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں علامہ ابن خلدون کی خودنوشت 'التعریف بابن خلدون' کے بعد کوئی قابل ذکر اور مستقل بالذات خودنوشت سامنے نہیں آئی۔ اگرچہ اس دور کے تین علماء -سخاوی، سیوطی اور ابن حجر عسقلانی- نے قدیم مورخین اور سیرت نگاروں کے طرز پر اپنی تصنیف کردہ تاریخی اور سوانحی کتابوں میں اپنی زندگی کی مختصر داستان بھی قلم بند کی ہے۔ سخاوی نے اپنی کتاب 'الضوء اللامع لأہل القرن التاسع'، سیوطی نے اپنی کتاب 'حسن المحاضرۃ' اور 'طبقات المفسرین' اور ابن حجر

عسقلانی نے اپنی کتاب 'رفع الإصر عن قضاۃ مصر' کے ذیل میں ضمناً اپنے احوال کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن اس تذکرہ کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہے۔ اس کے بعد مشہور مؤرخ ابن طولون نے اپنی کتاب 'الفلک المشحون فی أحوال محمد بن طولون' میں اور شعرانی نے اپنی کتاب 'لطائف المنن' میں کسی حد تک اپنی داستانِ زندگی بیان کی۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے درمیان ہمیں کوئی قابلِ ذکر خودنوشت نہیں ملتی۔ پورے عالمِ اسلام پر فکری جمود طاری تھا۔ اس کے براہِ راست اثرات ادب اور اس کے فنون پر مرتب ہوئے۔ اس پورے عرصہ میں علماء کی علمی زندگی سے متعلق بعض خفیف اشارے ملتے ہیں۔ یہ اشارے ان مؤلفین کی کتابوں کے مقدمے میں یا دوسرے سیرت نگاروں کے ذریعہ منقول شخصی اقوال کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ان میں کتابوں، اساتذہ، اسفار اور علمی آثار سے متعلق بعض باتیں ملتی ہیں۔ عبدالرحمٰن جبرتی کی کتاب 'عجائب الآثار فی التراجم والأخبار' میں ایسے بہت سے اقوال منقول ہیں جن سے متعلقہ افراد کی ذاتی علمی زندگی کے گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اٹھارہویں صدی کے با اثر اور ذی علم لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔[۲]

انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی مصر اور عالم عرب میں نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ جمود و تعطل اور زوال و ادبار کا خاتمہ ہوا اور لوگوں میں اپنے بہتر مستقبل کی تعمیر کی فکر پیدا ہوئی۔ اس کا ایک بڑا سبب مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے عربوں کی براہِ راست واقفیت تھی۔[۳] ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین کے حملہ کے بعد اس واقفیت اور تعارف کے مواقع دن بہ دن بڑھتے چلے گئے۔ اس میں کتابوں کی درآمد و برآمد سے لے کر افراد کی آمد و رفت وغیرہ شامل تھیں۔ الغرض علمی تبادلے اور استفادے کے نتیجے میں مصر اور دوسرے عرب ممالک میں بہت سے افراد اور تحریکیں اصلاح کا علم لے کر میدان میں آگئیں۔[۴] ان میں رفاعہ طہطاوی، احمد فارس الشدیاق، جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے قوم کو سیاسیات، معاشیات اور معاشرت کے نئے اصولوں سے روشناس کیا اور اسے تعلیم، آزادی، جمہوریت، تمدن اور

تشخص کے معانی و مفاہیم اور قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ ان کی کوششوں اور سعی و جہد سے عربی قوم کے تشخص اور انفرادیت کی بقااور تحفظ کا جذبہ ابھرا اور یہ فکر ہوئی کہ مغربی تمدن کی مسلسل یلغار کی وجہ سے عربی زبان کا قدیم فکری و روحانی سرمایہ جس خطرہ سے دوچار ہے اس کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔ چناں چہ اصلاح و بیداری کے علم بردار فی الواقع اس ضرورت کی تکمیل کے لیے بنیادی مواد اور ساز وسامان تیار کرنے میں لگ گئے۔۵ اس سلسلے میں رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۰-۱۸۷۳ء) پہلے مصری تھے جنھوں نے قوم کو اس کے فکری وثقافتی جمود اور سیاسی ومعاشرتی زوال پر متوجہ کیا۔ انھوں نے فرانس سے واپسی کے بعد اپنی کتاب 'تخلیص الابریز' کے ذریعہ قوم کو جدید تہذیب کے مظاہر سے مطلع کیا اور ایک نئی فکری تحریک کی بنیاد ڈالی، جو مروجہ فکری اور معاشرتی مفاہیم میں ردّو بدل کی علم بردار تھی۔ ان کی کتاب اور بعد کی دوسری کوششوں کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ خاص طور سے تعلیم اور سیاست کے میدان میں ان سے فائدہ اٹھایا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی میں جو اہم واقعات اور تغیرات رونما ہوئے ان کے پیچھے اِن کی شخصیت کے اثرات تھے۔ ان کے ساتھ جمال الدین افغانی کی تحریک بھی اپنے شباب پر تھی۔ اس کا مقصد جدید مغربی تہذیب کے اصول ومبادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کے اندر اسلام اور عربیت کی روح پھونکنا تھا۔ احمد فارس شدیاق بھی جمال الدین افغانی کے ساتھ تھے۔ شیخ محمد عبدہٗ ایک دوسری تحریک کے علم بردار تھے۔ اس کے اثرات بھی بعد میں بہت گہرے ثابت ہوئے۔ اس کا بنیادی محور یہ فکر تھی کہ تربیت کے ذریعہ ہی دینی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح ممکن ہے۔

ان مختلف کوششوں اور تحریکوں کے نتیجے میں بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے، جو اس وقت سے لے کر آج تک تعلیم یافتہ طبقے میں زیر بحث رہے ہیں۔ یہ مسائل سیاسی، معاشرتی، ادبی اور فکری نوعیت کے تھے۔ معاشرتی مسائل میں خاص طور سے عورت کا مسئلہ زیر بحث آیا۔۶ رفاعہ طہطاوی نے اپنی کتاب میں فرانسیسی عورت کے اخلاق و عادات پر گفتگو کے بعد عربی عورت کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اسی

طرح شدیاق نے بھی اپنی کتاب 'الساق علی الساق' میں مشرقی اور مغربی عورت کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ اس کے نزدیک عورت کو تعلیم اور معاشرتی حقوق سے بہرہ ور کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا مسئلہ قاسم امین سے پہلے ہی زیر بحث آچکا تھا۔ اس کے علاوہ علم اور دین، ترجمہ اور اقتباس اور اسلوب اور ادب سے متعلق مسائل بھی کافی زور شور سے علمی حلقوں میں بحث کا موضوع بنے ہوئے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جو خودنوشت سوانح حیات مرتب کی گئیں ان سب میں مذکورہ فکری اور اصلاحی مسائل اٹھائے گئے ہیں اور عربی معاشرے کے جمود و تعطل کو پیش کرکے اس سے نکلنے اور مغربی تہذیب سے استفادہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ رفاعہ طہطاوی کی 'تخلیص الابریز' اور علی مبارک کی 'علم الدین' اسی نوعیت کی کتابیں ہیں۔ انھیں خودنوشت کے فنّی مفہوم میں نہیں، بلکہ وسیع معنیٰ میں سوانح عمری کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شیخ محمد عبدہٗ کی خودنوشت میں بھی دینی، معاشرتی، لسانی اور ادبی اصلاحات کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ احمد فارس شدیاق نے بھی اپنی کتابوں میں مصر اور مغربی دنیا کی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالی ہے اور بہت سے مسائل پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے شدید تنقید کی ہے۔

اس زمانے کی خودنوشت سوانح عمریاں، جو فی الواقع اپنے موضوع کی ابتدائی کوششیں ہیں، مغربی اور عربی تمدن و ثقافت کے درمیان تصادم کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ عرب اس وقت اپنی شخصیت کے بنیادی عناصر کی تلاش و جستجو اور اس کی تعمیر و تشکیل میں کس حد تک مصروف تھے۔ عربی زبان میں جدید خودنوشت سوانح نگاری کا فن ابھی پورے طور پر ارتقا پذیر نہیں ہوسکا تھا، اس لیے یہ خودنوشت سوانح عمریاں فن کے تمام تقاضوں کی تکمیل نہیں کررہی ہیں، لیکن بہرحال انھیں صحیح سمت میں مناسب قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فی الواقع بعد کی تبدیلیوں کے لیے انھوں نے ایک مستحکم بنیاد فراہم کی۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ باوجود اس کے کہ ان خودنوشت سوانح عمریوں کے مؤلفین مغربی تہذیب اور ادب سے واقف تھے، لیکن انھوں

نے اپنی سوانح نگاری میں اس کا بہت کم اثر قبول کیا۔ ان سب نے اپنا تعلق عربی ادب کے قدیم ورثے سے جوڑے رکھا اور اپنی تصنیفات میں قدیم اور موروثی طرز نگارش اختیار کرنے کو پسند کیا۔ چنانچہ سابقین کی طرح یہ لوگ بھی اپنے علمی وفکری ارتقاء کا عرب پس منظر، بچپن سے لے کر خودنوشت کی تالیف تک کے حالات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر کبھی خاندان اور دوسرے امور کا تذکرہ نہ بھی ہوتو یہ فی الجملہ قدیم عرب علماء کے طرز نگارش سے مختلف نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ہمارے سامنے شیخ محمد عباد طنطاوی (۱۸۱۰-۱۸۶۱ء)، علی مبارک (۱۸۲۴-۱۸۹۲ء) اور شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹-۱۹۰۵ء) کی خودنوشت سوانح حیات ہیں۔ ان لوگوں نے خالص قدیم اور موروثی طرز نگارش اختیار کیا۔ ان کے علاوہ احمد فارس شدیاق، رفاعہ طہطاوی اور علی مبارک نے اپنی سوانح عمریوں میں مغربی ادب اور ثقافت سے معمولی اخذ واستفادہ کیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے موروثی عربی اسلوب، جو مقامات کے اسلوب سے بڑی حد تک متأثر تھا، اپنائے رکھا اور اسے نظر انداز کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ گویا اس طرح انیسویں صدی عیسوی میں اسلوب کے اعتبار سے عربی خودنوشت نگار دو حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک قدیم اسلوب کے حامل تھے اور دوسرے قدیم کے ساتھ کسی قدر جدیدیت بھی لیے ہوئے تھے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اہم تاریخ ساز شخصیتوں، ان کی مختصر خدمات اور ان کی خودنوشت سوانح عمریوں کا مختصر تعارف پیش کردیا جائے۔ یہاں ان کے دینی پہلو سے زیادہ ان کی ادبی حیثیت ہمارے پیش نظر ہے۔

۱- شیخ محمد عباد الطنطاوی (۱۸۱۰-۱۸۶۱ء):

شیخ طنطاوی کی وفات اور تدفین روس میں ہوئی۔ وہ وہاں پٹرس برگ یونی ورسٹی میں استاذ تھے۔ انھوں نے اپنے احوال اپنے قلم سے لکھ کر مشہور مستشرق فرین کو اس وقت حوالہ کیے تھے جب وہ مصر سے روس منتقل ہوئے تھے۔ یہ تحریر کراتشکوفسکی کی تصنیف 'حیاۃ الشیخ محمد عباد الطنطاوی' میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے خاندان، آباء و

اجداد، تعلیم کی ابتداء، مختلف تعلیمی مراحل، جامعہ ازہر کا زمانۂ طالب علمی، دوران تعلیم پڑھی گئی اہم کتابیں، جامعہ ازہر کے مختلف اساتذہ، تعلیم سے فراغت کے بعد مصر میں متعدد مصروفیات، دیگر اساتذہ اور رفقاء وغیرہ کا مختصر لیکن جامع تذکرہ کیا ہے۔ ۷؎ اس خودنوشت سوانح حیات سے سب سے اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مصر کے مختلف مدرسوں کا کیا حال تھا؟ اور جامعۂ ازہر میں تعلیم و تدریس کا نصاب اور طریقۂ کار کیا تھا؟ مثلاً انھوں نے بیان کیا ہے کہ ''انھوں نے جامعۂ ازہر میں مقاماتِ حریری اور معلقات کی شرح زوزنی پڑھی تھی اور ان سے پہلے انھیں کسی نے نہیں پڑھا تھا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازہر میں ادب اور شاعری کی کتابیں پہلے سے پڑھائی جاتی تھی۔ جدید عربی ادب کے بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیخ محمد عبدہٗ کے اہتمام سے ازہر میں مقامات بدیع الزماں، نہج البلاغۃ اور بلاغت کی بعض دوسری کتابیں داخل نصاب کی گئیں۔ ۸؎ شیخ طنطاوی کے مذکورہ بیان سے ان مؤرخوں کے خیالات کی تردید ہوتی ہے۔

۱۸۴۰ء میں شیخ طنطاوی روس چلے گئے۔ وہاں وہ اپنی علمی خدمات کی بنا پر حلقۂ استشراق میں کافی مقبول ہوئے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے طلبہ میں عربی ادب کا ذوق پیدا کیا۔ ان کے اس کارنامے کا اثر روس ہی نہیں پورے یورپ پر پڑا۔ کیونکہ اس سے پہلے مستشرقین عربی ادب سے واقفیت کے بغیر اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سے امور و مسائل میں غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتے تھے۔ شیخ کے اثرات کی وجہ سے مستشرقین میں عربی مآخذ سے براہ راست استفادہ کا رجحان عام اور مقبول ہوا۔ روس کا سفر کرنے سے پہلے مصر ہی میں ان کے تعلقات بعض یورپین اشخاص سے بہت گہرے ہوگئے تھے اور ان میں سے کچھ نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ ۹؎

۲- شیخ محمد عبدہٗ (۱۸۴۹-۱۹۰۵ء):

شیخ محمد عبدہٗ نے اپنی زندگی کے آغاز اور علمی سرگرمیوں پر دیگر علماء کی طرح

روشنی ڈالی ہے، لیکن یہ ان کی زندگی کی مکمل سوانح نہیں ہے۔ اس میں زندگی کے ابتدائی مراحل کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔۱۰ شیخ نے شروع ہی میں اپنی کتاب کی تالیف کا سبب اور محرک بیان کر دیا ہے۔ ایک طرف ان کے بعض مغربی ساتھیوں کا اصرار تھا، جو ان کے تجربات و مشاہدات کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے اور یہ خواہش رکھتے تھے کہ یہ تجربات ان کی زبان میں منتقل کر دیے جائیں۔ دوسری طرف ان کے شاگرد رشید رضا کی شدید خواہش تھی کہ شیخ اگر موجودہ نسل کے لیے نہیں تو آئندہ نسل کے لیے کچھ احوالِ زیست قلم بند کر دیں۔۱۱

اس کتاب میں شیخ محمد عبدہٗ نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مصر کے ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدائش اور پرورش کے باوجود انھوں نے اپنی تلاش و جستجو اور علم و معرفت کی بنیاد پر دو بڑے کارنامے انجام دیے۔ ۱- اندھی تقلید سے نکل کر اسلاف کے طرز پر آزادانہ فکر و نظر کی دعوت۔ ۲- عربی زبان کو مسجّع اور مقفّٰی بنانے کے بجائے آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش۔ اس وقت حکومت کے شعبوں اور اخبارات میں ناقابلِ فہم کلمات کا استعمال ہوتا تھا اور ازہر کے فارغین اور ادباء ایسے مسجّع اسالیب اختیار کرتے تھے جو معنٰی و مفہوم کی ترسیل سے قاصر تھے۔۱۲ اس کے علاوہ شیخ نے مصریوں کو ان کے حقوق سے روشناس کرانے اور اس مقصد میں حاصل شدہ کامیابیوں اور ناکامیوں کا مکمل تعارف پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی بیش تر صفات اور خوبیوں کا مرجع اپنے والدین کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق انھوں نے اپنے والد سے کم گوئی، وقار، سنجیدگی اور شرافت، اسی طرح والدہ سے رحم و مروت جیسی اخلاقی خوبیاں بہ طور وراثت پائی ہیں۔۱۳ اپنے حسب و نسب اور معاشرے کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد انھوں نے اپنے تعلیمی مراحل تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں شروع میں تعلیم سے بہت زیادہ دل چسپی نہیں تھی، وہ اس سے بھاگتے تھے، لیکن یکا یک ان کی ملاقات ان کے ایک صوفی مزاج رشتہ دار سے ہوگئی۔ اس بزرگ نے انتہائی دانائی اور حکمت سے ان کے اندر علم کا شوق پیدا کیا اور تحصیل علم کے راستوں کی

طرف رہ نمائی کی، جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ لہو ولعب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور علم کی کلید یعنی قرآن مجید سے تعلق مضبوط کیا جائے، چنانچہ انھوں نے اس پر عمل کیا۔ اس کا بے حد اثر اور فائدہ ہوا۔ انھوں نے مختلف مکاتب اور جامعۂ ازہر کے اساتذہ کے علاوہ دوسرے اساتذہ اور ماہرین علم وفن سے بھی استفادہ کیا، جن میں شیخ جمال الدین افغانیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ خود مذکورہ صوفی بزرگ سے بھی برابر استفادہ جاری رہا۔[۱۴] اس طرح انھوں نے فلسفہ، کلام اور ریاضی (یہ علوم جامعہ ازہر میں ممنوع تھے) کی تحصیل شیخ جمال الدین افغانیؒ سے کی اور اخلاق، نفسیات، معاشرت، تاریخ، فلسفہ اور تربیت کے بہت سے علوم مغربی علماء کی تحریروں سے استفادہ کرکے حاصل کیے۔ اس کے لیے انھوں نے فرانسیسی زبان بھی استفادے کی حد تک سیکھ لی۔ دورِ حاضر کی علمی ضروریات کے پیش نظر وہ مسلم علماء اور مصلحین کے لیے یورپ کی کسی زبان میں مہارت حاصل کرنا ضروری قرار دیتے تھے۔ تحصیل علم کے بعد انھیں جامعۂ ازہر میں، وہاں کے شیوخ کی مخالفت کے باوجود، درس وتدریس کے لیے منتخب کرلیا گیا۔[۱۵]

عبدہٗ کی خودنوشت کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ دورِ حاضر کے ایک عظیم مفکر کو علم ومعرفت کی راہ میں کس قدر مشقت برداشت کرنی پڑی اور ایک مستحکم فکر، رائے اور نظریہ قائم کرنے، نیز اسے لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس خودنوشت میں مصنف کا ادبی اسلوب بہت نمایاں ہے۔ وہ ترسیلی اسلوب کے زبردست داعی تھے۔ ان کی خود نوشت قدیم عرب علماء کی خودنوشتوں سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہے کہ اس میں پیدائش اور نشو ونما وغیرہ کا تذکرہ بالکل اُن ہی کے انداز میں کیا گیا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ قدماء کے یہاں واقعات کا تذکرہ اور تاریخی حقائق کا بیان اس انداز میں ہوتا ہے کہ اس میں ادبی اسلوب مفقود ہوتا ہے اور یہاں ادبیت کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح گویا وہ قدیم علماء سے مطابقت کے باوجود اپنی ایک علاحدہ اور امتیازی شناخت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔

۳- رفاعہ طہطاوی (۱۸۰۱-۱۸۷۲ء)

یہ ازہر کے تعلیم یافتہ اور طہطا کے باشندے تھے۔ محمد علی کی توجہ اور خواہش سے جو وفود بیرونِ ملک مختلف مقاصد کے تحت بھیجے جاتے تھے ان ہی میں سے ایک وفد کے مذہبی امور کا انچارج بنا کر انھیں فرانس بھیجا گیا۔[۱۶] وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اور افکار و خیالات کا خلاصہ تحریر کیا اور اسے 'تخلیص الابریز فی تلخیص باریز' نامی کتاب کی شکل میں پیش کیا۔ طہطاوی فرانسیسی تہذیب و تمدن اور اس کے عملی مظاہر سے بے حد متاثر تھے، اس وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ اس تہذیب کی کچھ جھلکیاں پیش کر کے وہ اپنے ہم وطنوں کو اس کی اتباع اور تقلید کی دعوت دیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک مفید اور بامقصد کتاب قرار پاتی ہے۔[۱۷]

اس کتاب میں مقدمہ اور چار ابواب کے علاوہ کچھ تنقیدی مقالات بھی ہیں۔ مجموعی طور سے یہ کتاب فرانسیسی زندگی کے بارے میں دل چسپ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس میں مصریوں کے عقلی و فکری نہج اور اس کے ارتقائی مراحل کی داستان بھی آ گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رفاعہ طہطاوی اس فکری ارتقاء کی ایک اہم کڑی تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اپنی شخصیت، حسب و نسب، خاندان اور شہر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں، پھر فوج میں اپنی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے فرانس کے سفر کے محرکات اور اسباب کا تذکرہ کیا ہے۔ اس بات کو خاص طور سے پیش کیا ہے کہ سفر سے قبل ہی بعض قدر دانوں اور خاص طور سے شیخ حسن عطار کی طرف سے رودادِ سفر لکھنے کا مطالبہ تھا۔ وہ عجائبات عالم سے واقفیت کے بے حد شوقین تھے، لیکن اتفاق سے صرف سفر ہی نہیں، بلکہ سفر کے نتائج، اغراض و مقاصد اور فرانس کے علوم و فنون پر ایک جامع کتاب مرتب ہوگئی۔

اس کتاب میں مصنف کے ذاتی احساسات، تاثرات اور قلبی کیفیات کا تذکرہ بے حد مختصر ہے، البتہ سفر کے واقعات و مشاہدات اور فرانسیسی عادات و اطوار وغیرہ پر

تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں زمانی ترتیب کا خیال کم رکھا گیا ہے۔کتاب میں فکری پہلوادبی پہلو پر غالب آ گیا ہے،اس وجہ سے یہ ایک خشک کتاب ہوگئی ہے۔مغربی زندگی سے متعلق کسی مشرقی آدمی کی یہ پہلی تاثراتی کاوش ہے۔اس میں فوجی زندگی کے اہم عناصر اور اس کی اہم خوبیاں، مثلاً علم، فکر، دستور، سیاست، اجتماع، جمہوریت اور آزادیٔ نسواں وغیرہ ابھر کر سامنے آ گئی ہیں۔کتاب میں اس ضرورت کا احساس بھی دلایا گیا ہے کہ مشرق میں یہ خوبیاں اپنے حقیقی مفہوم میں اب تک ناپید ہیں۔

رفاعہ،علی مبارک اور شدیاق کو اپنے بیرونی اسفار کی تدوین کا موقعہ ملا۔انھوں نے اپنے سفرناموں میں ذاتی امور پر گفتگو کے ساتھ مغربی زندگی اور ادب کی تصویر بھی کھینچی ہے، کیوں کہ یہ لوگ مغربی ادب اور ثقافت سے نہ صرف یہ کہ واقف تھے، بلکہ اس سے مرعوب اور متاثر بھی تھے۔لیکن مغربی تہذیب کی عکاسی اور ترجمانی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انھوں نے اپنے ماضی سے اپنا تعلق بالکل منقطع کرلیا ہو۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک ان کا طرز تحریر وتعبیر بڑی حد تک موروثی یا روایتی رہا۔قدیم اسلوب میں جدید مضامین کا ادا کرنا ایک مشکل کام ہے۔اس وجہ سے ان لوگوں کو کبھی کبھی پریشانیوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، خاص طور سے بعض نئے الفاظ اور مصطلحات کی ادائی میں۔اس بنا پر ان کی کتابیں عربیت اور مغربیت کے مابین ایک سنگم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں دونوں کے درمیان تال میل اور یگانگت پیدا کرنے کی بہترین کوششیں کی گئی ہیں۔رفاعہ طہطاوی کے یہاں یہ وصف اور زیادہ نمایاں ہے۔

۴-احمد فارس الشدیاق (۱۸۰۴-۱۸۸۷ء)

یہ لبنان کے ایک عیسائی خانوادے کا فرزند تھا، جو تعلیم وتعلم کے بعد تلاش معاش اور مزید تحصیل علم کے لیے مصر آیا اور پھر مختلف مقاصد کے تحت عرب، افریقہ اور یورپ کے کئی ممالک کا سفر کرنے کے بعد تیونس میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا۔اس نے اپنی کتاب 'الساق علی الساق فیما ہو الفاریاق' میں اپنی زندگی اور اس کے اہم تجربات و

واقعات پیش کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز اس نے لبنان کے ایک گاؤں 'عشقوت' میں اپنی پیدائش کے تذکرے سے کیا ہے اور اختتام ۱۸۵۵ء یعنی زمانۂ تالیف کتاب تک کے حالات و واقعات پر ہوتا ہے۔ اس میں مصنف کی شخصیت اپنے معاصر خودنوشت نگاروں علی مبارک اور رفاعہ طہطاوی کے بالمقابل زیادہ نمایاں اور واضح ہے۔ انھوں نے مالٹہ، انگلستان اور فرانس کی سفری داستانوں کو اس مقصد کے لیے پیش کیا ہے کہ اپنے خیالات و افکار کی روشنی میں مغرب و مشرق کی رسوم و بدعات پر یکساں طور سے تنقید کرسکیں۔ ۱۸

باوجود اس کے کہ شدیاق کو فصیح عربی زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ سجع وقوافی اور صنائع لفظی سے بہت دور رہتے تھے، لیکن اس کتاب میں اپنی زبان دانی کے زعم میں انھوں نے جابجا مترادف الفاظ اور استطرادات کا استعمال کیا ہے، جس سے ان کی کتاب میں وہ شیریں افسانوی اندازِ تحریر مفقود ہوگیا ہے جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس طرح اگرچہ وہ جدید ادب اور نثر نگاری کو نیا رخ دینے والوں میں پیش پیش تھے، لیکن یہاں وہ مقامات حریری و ہمدانی کے اسلوب اور مزاج سے اپنے آپ کو الگ نہیں کرسکے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے خالص تقلیدی راہ اختیار کرلی تھی۔ دراصل انھوں نے اس میں بھی ایک طرح کا لطف و مزاح پیدا کردیا تھا، چنانچہ ایک مقام پر جہاں وہ اپنی بیوی سے کسی بات چیت کا حوالہ دینا چاہتے ہیں، وہاں تخیلات اور مزعومات کے سہارے عورت کے بارے میں اپنے تمام خیالات نہایت مضحکہ خیز انداز میں پیش کرجاتے ہیں، جو غیر سنجیدگی اور عریانیت تک پہنچ جاتا ہے۔ ۱۹

شدیاق نے علی مبارک اور رفاعہ کی طرح مغربی اور مشرقی زندگیوں کی تصویر پیش کی ہے، لیکن مقصد اور شخصیت کا فرق ان میں نمایاں ہے۔ جہاں تک رفاعہ کا معاملہ ہے انھوں نے 'تخلیص الابریز' میں اپنی عقل اور فکر کا استعمال کرتے ہوئے اس دور کے فکری، سیاسی اور معاشرتی مسائل سے تعرض کیا ہے اور مختلف انسانی مشکلات کے تعلق سے مغربی علماء و مفکرین کے اقوال کو بحث و تجزیہ اور تحلیل و تبصرہ کے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس پوری بحث میں ان کی ذات تقریباً پوشیدہ ہے، اس لیے کہ وہ اپنے شخصی تاثرات

کے بالمقابل مشاہدات اور مسموعات وغیرہ پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔اس کے علی الرغم شدیاق اپنی ذات، خیالات اور افکار میں گم رہتے ہیں۔اس لیے انھوں نے تقریباً ہر مشاہدے، رائے اور فکر میں اپنی پُرمزاح اور مضحکہ آمیز شخصیت کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔کہیں کہیں غیر سنجیدگی اور عبث گوئی کا مظاہرہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔اپنے وطن اور اپنے سفر کے تذکرے کے دوران عیسائی شخصیات اور مذہبی شعائر کے بارے میں ان کا اندازِ بیان تقریباً ناپسندیدہ ہے۔

شدیاق کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تجربات کے اظہار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، گویا مشاہدات و ملاحظات میں اپنے تجربات کی آمیزش کر دیتے ہیں۔رفاعہ طہطاوی کے برعکس وہ جگہ جگہ مختلف مسائل کے تحت اپنی ذاتی رایوں کو داخل کر دیتے ہیں۔خاص طور سے انھوں نے عورت کے بارے میں بڑے طویل، مفصل اور غیر سنجیدہ مباحث چھیڑے ہیں۔وہ ان مباحث کے لیے موقع ومحل کی مناسبت وغیرہ کا سرے سے خیال نہیں رکھتے، بس عورت کا لفظ آجانا ان کے لیے کافی ہوتا ہے۔ایک موقع پر انھوں نے مصری عورت کی شب زفاف کی جو تصویر کشی کی ہے وہ حد سے زیادہ شرم ناک ہے۔

مترادفات کی کثرت اور عورت کے سراپا کی تصویر کشی میں مبالغہ آرائی پر تعجب اور حیرت اس وقت نمایاں طور سے کم ہو جاتی ہے جب شدیاق کی یہ وضاحت سامنے آتی ہے کہ اس کتاب کا مقصد زبان کے عجائبات کو پیش کرنا اور عورت کی خامیوں اور خوبیوں کو نمایاں کرنا ہے۔پہلے مقصد کے لیے انھوں نے زبان کے مترادفات کا استعمال کیا اور ان کے معانی ومفاہیم کی وضاحت کی۔[۲۰] اور دوسرے مقصد کے لیے عورت کی دیگر خوبیوں کے ساتھ اس کے حسن و جمال اور جذبات و احساسات کی تصویر کشی کی۔[۲۱] اس طرح یہ کتاب 'تعلیم لغت' کا ایک عظیم مقصد بھی لیے ہوئے ہے۔مقصد خواہ کتنا ہی بلند ہو، لیکن اس کے حصول کے لیے غلط طریقے اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔غیر سنجیدگی اور مزاح سے احتراز کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ ان کی فطرت کا ایک لازمی حصہ تھا، جو تا حیات ان سے وابستہ رہا۔

اس کتاب کے غیر سنجیدہ اور مزاحیہ عنصر پر جس قدر چاہے نکیر کی جائے، لیکن اس سے اس کی ادبی اور لغوی حیثیت مجروح نہیں ہوتی۔ شدیاق اس پہلو سے جدید مصر میں عربی ادب کے معمار تھے اور انھوں نے ادب ولغت کی اصلاح وترقی میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ یہ ان کی اور ان کے بعض معاصرین کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی میں عربی ادب اپنی پوری شان کے ساتھ ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل کھڑا ہوسکا اور اس نے دور جدید کی علمی ضرورت کو انتہائی خوش اسلوبی اور فراخ دلی سے پورا کیا۔

بہر حال یہ کتاب عصر حاضر کی سب سے پہلی باضابطہ خودنوشت سوانح عمری تصور کی جاتی ہے، جو مؤلف کے ہر مرحلۂ زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔[۲۲]

۵-علی مبارک (۱۸۲۴-۱۸۹۲ء)

علی مبارک کا تعلق مصر کے شمال مشرق میں واقع ایک گاؤں سے تھا۔ ان کا خاندان اس گاؤں میں مذہبی امور کی انجام دہی پر مامور تھا۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے امتیازی نمبروں کی بنیاد پر انھیں فرانس جانے والے طلبہ کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ۱۸۴۴ء میں فرانس بھیج دیا گیا۔ فرانسیسی زبان نہ جاننے کی وجہ سے انھیں ابتدا میں خاصی زحمتیں اٹھانی پڑیں، لیکن انتھک محنت اور لگن کی وجہ سے بہت جلد انھوں نے اس مشکل پر قابو پالیا۔ چودہ سال فرانس میں گزارنے کے بعد جب وہ مصر لوٹے تو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو قوم کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کردیا۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے مغربی اور مشرقی معاشرت، دونوں کے امتیازی گوشے، دونوں کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات اور دونوں کی روشنی میں قوم کی ترقی کے امکانات اور ذرائع پر کم از کم دو کتابیں تصنیف کیں: ۱-الخطط التوفیقیۃ، ۲-علم الدین۔ پہلی کتاب مفصل، باضابطہ اور بامقصد خودنوشت سمجھی جاتی ہے، جب کہ دوسری کتاب مکالمے اور گفتگو کے انداز میں فکر کے ایک

خاص پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ اس میں مذکور دونوں کردار فرضی اور تخیلاتی ہیں، لیکن ان کے خیالات مفید، کارآمد اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلی کتاب قدماء کے طرز نگارش سے زیادہ قریب ہے اور دوسری کتاب کسی حد تک جدید اسلوب اور مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔ گویا پہلی شیخ محمد عبدہٗ اور شیخ محمد عباد طنطاوی کی تحریروں سے مماثلت رکھتی ہے، جب کہ دوسری رفاعہ طہطاوی اور احمد فارس شدیاق کے اسلوب نگارش سے قریب تر ہے۔۲۲ ذیل میں دونوں کتابوں کا تعارف کرایا جاتا ہے:

۱- **الخطط التوفیقیة:** علی مبارک نے یہ کتاب اپنی وفات سے چار سال قبل ۱۸۸۹ء میں مکمل کر لی تھی۔ یہ ایک مفصل خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی پیدائش، والدین، گاؤں، خاندان، مکتب کی ابتدائی و ثانوی تعلیم، اس زمانے کے مکاتب کا حال، تعلیم کے لیے فرانس کا سفر، واپسی اور اس کے بعد مصر میں اپنی مصروفیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔۲۴ انھوں نے خودنوشت نگاری کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر جگہ صداقت اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اپنی کم زوریوں کے اعتراف میں انھیں کوئی جھجھک نہیں ہوتی، مثلاً تعلیمی مراحل کے بارے میں ان کا یہ اعتراف بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ہمیشہ کم زور اور بھگیڑ و طالب علم رہے۔۲۵ حالاں کہ بڑے لوگ بالعموم بچپن ہی سے اپنی علمی استعداد اور مہارت کا سکہ بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر فخر و مباہات کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ انھوں نے فرانس سے واپسی کے بعد اپنے گھر لوٹنے اور فرانسیسی فوجی لباس میں ہونے کی وجہ سے والدہ کے نہ پہچاننے کا ذکر بڑے دل چسپ انداز میں کیا ہے۔۲۶ انھوں نے مصر واپس لوٹ کر جو مختلف ذمہ داریاں انجام دیں ان کا اور خاص طور سے اپنی تعلیمی کوششوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب جدید مصر میں تعلیم کے تاریخی ارتقاء کی ایک دستاویز بن گئی ہے۔ تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے کی وجہ سے انھیں 'ابو التعلیم فی مصر' کا لقب دیا گیا۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کی نمایاں خدمات میں فوجی اسکول کی تنظیم نو، حساب، ریاضی اور انجینیرنگ کے پیچیدہ مسائل پر غور و فکر اور خدیو اسماعیل کے عہد میں مصر کے تعلیمی نظام کی

اصلاح و تربیت کی کوشش خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے ادب اور لغت کی بہترین تعلیم کے لیے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی اور اپنے تعلیمی افکار سے عوام کو واقف کرانے کے لیے ایک مجلّہ 'روضۃ المدارس المصریۃ' کا اجراء کیا اور تعلیمی ضروریات کے تحت مناسب کتابوں کی اشاعت کے لیے 'دارالکتب' کے نام سے ایک مطبع کی بھی بنا ڈالی۔ ان کوششوں کا تعلیمی بیداری پر بڑا مفید اثر مرتب ہوا۔ فی الواقع یہ کوششیں آئندہ کی ثقافتی ترقیوں کے لیے مضبوط بنیاد ثابت ہوئیں۔ ۲۷

اس کتاب کا اسلوب مرسل ہے۔ اس میں سجع اور تکلف نہیں ہے، البتہ اکثر مقامات پر بے ربطی اور اضطراب پایا جاتا ہے، جس کے باعث تحریر کی سلاست اور حلاوت متاثر ہوئی ہے۔ چوں کہ اس کتاب میں اعداد و شمار، تاریخ اور بعض دوسری تفصیلات کثرت سے موجود ہیں، اس لیے یہ ادبی سے زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل بن گئی ہے۔ اس کے ہر صفحہ سے علی مبارک کی خاک ساری اور انکسار کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض مواقع پر ان کا انداز پیش کش بے حد مؤثر اور جاذب نظر ہے۔ مثلاً فرانس سے طویل وقفے کے بعد واپسی پر انھوں نے اپنی ماں کے جذبات کی جس خوب صورت انداز اور دل کش الفاظ میں تصویر کشی کی ہے، وہ سحر بیانی اور حقیقت نگاری کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ۲۸

علی مبارک نرم مزاج اور خاموش طبیعت کے مالک تھے۔ وہ معاملات کو شور و شغب اور بغاوت سے کچلنے کے بجائے احتیاط، نرمی اور حکمت سے حل کرنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ عرابی پاشا کے انقلاب کے مخالف تھے اور اسے حکومت کے خلاف بغاوت تصور کرتے تھے، جس کا حاصل ان کی نظر میں انتشار اور انارکی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

۲-علم الدین : علی مبارک نے اپنی اس کتاب میں بدلتے ہوئے حالات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے بحر و بر کے عجائبات اور غیر مانوس مخلوقات کی تصویر کشی کے لیے ایک فرضی مصری عالم اور ایک انگریز کے درمیان مکالمہ کرایا ہے۔ ان دونوں کی بحث و گفتگو اور سوال و جواب کے ذریعہ مشرق و مغرب کے احوال تقابلی

انداز میں سامنے آ گئے ہیں۔ گویا رفاعہ طہطاوی کی طرح علی مبارک بھی اپنے ہم وطنوں کو مغرب کے احوال اور مغربی تہذیب و تمدن کے مفید ثمرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ مشرق و مغرب کے مابین فکری اور معاشرتی پہلوؤں پر اظہار خیال اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کی راہیں آسان ہوں۔ ۲۹

کتاب میں علم الدین کو ایک ازہری شیخ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، جنھیں ایک انگریز کے ساتھ یورپ کی سیاحت کا موقع فراہم کیا گیا۔ وہ مغرب کی ہر چیز کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں اور اس کی حقیقت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے انگریز دوست کی وضاحت سے مغربی طور و طریق پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو کبھی مشرقی اقدار کا مخالف قرار دے کر انھیں رد کر دیتے ہیں۔ اس طرح مصنف مشرق و مغرب کے ردّ و قبول کے پیمانے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اس میں دونوں طبائع اور جبلّتوں کا اسی انداز میں مقابلہ اور مقارنہ کیا گیا ہے، جیسا کہ محمد مویلحی نے اپنی کتاب 'حدیث عیسیٰ بن ہشام' میں کیا ہے۔ دونوں میں بڑی حد تک مطابقت ہے، البتہ مویلحی نے مغربی زندگی کو مزید واضح کر کے پیش کیا ہے۔ ان کا اسلوب بھی مغربی سے قریب ہے، لیکن وہ مغرب کی تقلید میں حد سے زیادہ احتیاط کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں ماضی سے رشتہ قائم رکھنا از حد ضروری اور لازم ہے۔

اس کتاب میں 'علم الدین' کی شخصیت اگرچہ فرضی ہے، لیکن مؤلف کی شخصیت سے بے حد متشابہ اور قریب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک فرضی کردار کے پردے میں اپنی شخصیت اور اپنے افکار کی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ والد صاحب کا 'علم الدین' کو جامعہ ازہر بھیجنا، وہاں ایک انگریز سے بلا قصد و ارادہ اچانک ملاقات ہو جانا اور دونوں کا سفر پر آمادہ ہو جانا، ان سب میں مؤلف کی تصویر نظر آتی ہے، خاص طور سے علم الدین میں مکالمات کے دوران جو معلومات اور افکار پیش کیے گئے ہیں ان کا مرجع زیادہ تر فرانسیسی مآخذ ہیں۔ علی مبارک فرانسیسی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی شخصیت سے مناسبت اور ہم آہنگی کی وجہ سے اس کتاب کو بھی ہم ان کی ایک خود نوشت تسلیم کر سکتے ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ روزنتال،علم التاریخ عندالمسلمین،ص ب-ج

۲۔ شوقی ضیف، الترجمۃ الشخصیۃ،ص۱۲-۱۰۴

۳۔ عبدالکریم الاشتر، النثر المہجری، دارصادر بیروت، ۱۹۹۰ء

۴۔ انیس المقدسی، الاتجاہات الأدبیۃ، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۸ء،ص۳۶۷-۳۸۰

۵۔ حوالہ سابق،ص۱۰۱-۱۰۶

۶۔ حوالہ سابق،ص۲۵۲

۷۔ کراتشکوفسکی، حیاۃ الشیخ محمد عباد الطنطاوی، ترجمہ کلثوم عودۃ، قاہرہ، ۱۹۶۴ء، ص۱۱۱-۱۱۳

۸۔ حوالہ سابق،ص۱۱۲

۹۔ حوالہ سابق،ص۱۱۲

۱۰۔ سید رشید رضا، تاریخ الاستاذ الامام، مطبعۃ المنار قاہرۃ، ۱۹۳۱ء، جلد اول،ص۹، ۳۸، ۱۰۲-۱۰۵

۱۱۔ حوالہ سابق،ص۹-۱۰

۱۲۔ حوالہ سابق،ص۱۱-۱۲

۱۳۔ حوالہ سابق،ص۱۳-۱۴

۱۴۔ حوالہ سابق،ص۱۶-۲۳

۱۵۔ حوالہ سابق،ص۲۰۱-۲۰۵

۱۶۔ جمال الدین الشیال، التاریخ والمؤرخون فی مصر، لجنۃ التالیف، القاہرۃ، ۱۹۵۸ء، ص۵۴-۵۹

۱۷۔ رفاعہ طہطاوی، تخلیص الابریز فی تلخیص باریز، وزارۃ الثقافۃ والارشاد، قاہرہ، ۱۹۵۸ء،ص۵۶-۵۷

۱۸۔ احمد فارس الشدیاق، الساق علی الساق فیما ہوالفاریاق،طبع باریس،ص۶۰-۶۱

۱۹۔ حوالہ سابق،ص۴۴۶-۴۵۱

۲۰ حوالہ سابق، ص ۱
۲۱ حوالہ سابق، ص ۱۷
۲۲ محمد احمد خلف اللہ، احمد فارس الشدیق و آثارہ اللغویۃ، ص ۹
۲۳ التاریخ والمؤرخون فی مصر، ص ۹۹-۱۱۲
۲۴ علی مبارک، الخطط التوفیقیۃ، المطبعۃ الامیریۃ، بولاق، ۱۳۰۵ھ، ص ۳۸-۴۰
۲۵ حوالہ سابق، ص ۴۱
۲۶ حوالہ سابق، ص ۴۲-۴۳
۲۷ حوالہ سابق، ص ۵۱-۵۲
۲۸ حوالہ سابق، ص ۵۷-۵۸
۲۹ علی مبارک، علم الدین، طبع قاہرہ، مصر، ۱۸۸۳ء، جلد اول، ص ۸

☆☆☆

معرکۂ اسلام و جاہلیت

مولانا صدرالدین اصلاحی

اسلام کی بصیرت افروز آگہی کے لیے جاہلیت سے واقفیت ناگزیر ہے۔
☆عقائد، عبادت، اخلاقیات اور زندگی کے تمام معاملات میں جاہلیت اور اسلام کے درمیان اصولی فرق کیا ہے؟
☆دونوں کے درمیان فطری اور مسلسل کش مکش کا انداز کیا ہے؟
☆جاہل عناصر کس طرح اسلامی تصورات میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں؟
ان اہم پہلوؤں پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے گہر بار قلم نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ صفحات: ۲۱۶ قیمت:-/۸۵ روپئے
اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسرار احمد خان نے انتہائی معیاری اور دلکش اسلوب میں Islamic Civilization in its Real Prespective کے نام سے کیا ہے۔
آفسیٹ کی عمدہ طباعت صفحات: ۱۳۷ قیمت:-/۹۰ روپئے

ملنے کے پتے: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

بحث ونظر

تدریسِ قرآن میں احادیث سے استفادہ
منہج وطریقۂ کار

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری

قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب ہے، جو خاتم النبیّین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کرنے کے بعد یونہی نہیں چھوڑ دیا کہ اُسے جو چاہے پڑھے، اور جس آیت کا جو چاہے مطلب نکال لے، بلکہ ساتھ ہی اپنے رسول پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی کہ آپ انسانوں کے سامنے اس کے معانی کی وضاحت کردیں۔ فرمایا:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ (النحل:۴۴)

ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا ہے، تاکہ جو چیزیں لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہیں، آپ انھیں ان لوگوں کے لیے بیان کردیں۔

آں حضرت ﷺ نے اس فرض کو بہ خوبی سرانجام دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ۔ (البقرۃ:۱۵۱)

جس طرح تم لوگوں میں ایک عظیم الشان رسول بھیجا تم ہی میں سے، جو ہماری آیات تمھارے سامنے تلاوت کرتے ہیں اور تمھیں پاک کرتے ہیں اور تم کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تم کو ایسی مفید باتیں سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

[مزید ملاحظہ کیجیے آل عمران:۱۶۴، الجمعۃ:۲]

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے 'مبیّن' (وضاحت

کرنے والے) ہیں۔قرآن کریم کی تبیین وتوضیح آپؐ کے ذریعہ کس طرح ہوئی، اس کی دوشکلیں ہیں: ایک تلاوت آیات، دوسری تعلیمِ کتاب۔'تلاوت آیات' تو ایک واضح چیز ہے، لیکن 'تعلیم کتاب' سے کیا مراد ہے؟۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر 'تعلیم کتاب' سے مراد بھی کلماتِ قرآنی کو پڑھ کر سنانا اور یاد کرانا ہوتو یہ 'تلاوتِ آیات' سے الگ چیز نہ ہوئی، لیکن جب اسے الگ سے بیان کیا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اول الذکر سے الگ چیز ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر اس سے مراد آیات کی تشریح، اس کے معانی ومطالب کی توضیح اور اس کے احکام کا بیان ہوا۔

'تلاوتِ آیات' کیسے ہوگی اور تعلیم کتاب کیسے؟ یہ سب 'تبیینِ قرآن' میں داخل ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہم 'سنت' یا 'احادیثِ کریمہ' کے مجموعے سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیوں کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کا نام ہے۔[۱]

قرآن صرف تلاوتِ آیات کا حکم دیتا ہے، اس کی کیفیت نہیں بتاتا۔ سوال یہ ہے کہ جیسے تیسے آیاتِ قرآنی پڑھ دینے کا نام 'تلاوتِ آیات' ہے، یا اس کا کوئی مخصوص اسلوب اور طریقہ ہے؟ یہ چیز ہمیں رسول اللہ ﷺ کے 'بیان' سے معلوم ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے:

ان ھذا القراٰن انزل علیٰ سبعة احرف فاقرء وا ما تیسّر منه۔[۲]	یہ قرآن سات حرفوں (قرأتوں) پر اتارا گیا ہے، تمھیں اس میں سے جو آسان ہو، وہ پڑھو۔

دوسری روایت میں ہے:

أقرأنی جبرئیل علیٰ حرف فراجعته فلم أزل استزیده ویزیدنی حتی انتھیٰ الیٰ سبعة احرف۔[۳]	جبرئیل نے مجھے ایک حرف (قرأت) پر قرآن پڑھایا، پس میں نے ان سے مراجعت کی اور برابر زیادہ مانگتا رہا اور وہ زیادہ کرتے رہے، یہاں تک کہ سات حرفوں (قرأتوں) تک پہنچے۔

'سات حروف' سے مراد خواہ سات قراءتیں ہوں یا سات لغات[۴]۔ بہرحال

نبی کریم ﷺ کے 'بیان' سے ظاہر ہوگیا کہ 'تلاوت آیات' سے مراد عامیانہ یا سادہ انداز میں قرآن پڑھنا نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی ایک خاص اسلوب اور طریقہ ہے۔ درج ذیل احادیث بھی 'تلاوتِ آیات' کے مخصوص اسلوب پر دلالت کرتی ہیں:

عن قتادة قال سئل انس كيف كانت قرأة النبى ﷺ فقال كانت مدّا ثم قرأ بسم الله الرحمن الرحيم يمدّ ببسم الله، ويمدّ بالرحمٰن، ويمدّ بالرحيم۔[۵]

حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی قرأت کیسی تھی؟ کہا: لمبی قرأت تھی، پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی، بسم اللہ کے ساتھ آواز لمبی کی، پھر رحمٰن کے ساتھ آواز لمبی کی، پھر رحیم کے ساتھ آواز لمبی کی۔

عن حذيفة قال قال رسول الله ﷺ اقرء وا القرآن بلحون العرب وأصواتها وايّاكم ولحون أهل العشق ولحون أهل الكتابين ۔[۶]

حذیفہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن کو عربوں کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو۔ اور عشق والوں کے طریقے اور دونوں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے طریقے سے بچو۔

جب رسول اللہ ﷺ مشرکین کے سامنے 'تلاوت آیات' کرتے تھے تو اس کے مضامین، اس کی عربیت، اس کی بلاغت اور اس کی بلند آہنگی کے علاوہ، خود اس کا طریقۂ ادا، طرزِ ادا اور اندازِ تلاوت بھی مشرکین کو متاثر کرتا تھا۔

مرادِ قرآنی تک پہنچنا صرف کتبِ لغت اور کلام عرب سے ممکن نہیں

کتبِ لغت، کلامِ عرب اور جاہلی ادب وغیرہ کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن قرآن کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کی مراد تک صرف ان کے سہارے نہیں پہنچا جاسکتا۔ کسی لفظ یا جملہ کا لغوی معنیٰ ایک چیز ہے اور اس کی اصل مراد دوسری چیز ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔(البقرۃ:۱۸۷)

کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ تمھیں صبح کا سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے ممتاز ہوجائے۔

لغت کی رو سے **الخیط الابیض** (سفید دھاگا) اور **الخیط الاسود** (سیاہ دھاگا) کا بالکل واضح اور صاف مفہوم ہے، مگر آیت میں یہ مراد نہیں ہے۔ حضرت عدیؓ بن حاتم، جو خود اہلِ زبان تھے، رسول اللہ ﷺ سے اس کا مطلب دریافت کرنے پر مجبور ہوئے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

لا بل هو سواد الليل و بياض النهار۔[۷]

(اس سے سفید اور سیاہ دھاگے مراد نہیں ہیں) بلکہ رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہی ایک اور آیت ہے:

الَّذِيْنَ يَأْكُلُونَ الرِّبٰوا لاَ يَقُومُونَ إِلاَّ كَمَا يَقُومُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔(البقرۃ:۲۷۵)

جو لوگ 'ربا' کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں گے قیامت میں قبروں سے مگر اس طرح، جیسے کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جسے شیطان لپٹ کر خبطی بنادے (یعنی حیران و مدہوش) یہ سزا اس لیے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ 'بیع' بھی مثل 'ربا' کے ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے 'بیع' کو حلال فرمایا ہے اور 'ربا' کو حرام کردیا ہے۔

'ربا' کے لغوی معنیٰ 'زیادتی' کے ہیں، خواہ وہ کسی قسم کی ہو، خود بیع کا مقصد بھی اپنی ملکیت میں اضافہ کرنا ہی ہوتا ہے، ایسی صورت میں 'ربا' میں وہ بیوع بھی داخل ہیں جو شرعی مفہوم میں ربا پر مشتمل ہوتی ہیں اور وہ بیوع بھی جو شرعاً 'ربا' پر مشتمل نہیں ہوتیں، اگر کوئی چاہے کہ اس آیت کی مراد تک کتبِ لغت اور کلامِ عرب کی مدد سے پہنچے تو یہ ناممکن ہے، اس کے لیے تو اس ذاتِ گرامی کا 'بیان' چاہیے جس پر قرآن نازل ہوا تھا، وہ بیان یوں ہے:

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الذهب بالذهب و الفضة بالفضة والبرّ بالبرّ والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل يداً بيد، فمن زاد او استزاد فقد أربىٰ، الأٰخذ والمعطى فيه سواء ۔۸

سونا، سونے کے بدلے، چاندی، چاندی کے بدلے، گیہوں، گیہوں کے بدلے، جو، جو کے بدلے، کھجور، کھجور کے بدلے، نمک، نمک کے بدلے، برابر برابر، دست بدست بیچا جائے۔ اور جس نے زیادہ دیا، یا زیادہ طلب کیا وہ سود میں مبتلا ہوگیا، لینے والا اور دینے والا سب اس میں برابر ہیں۔

اس حدیث میں جن چھ چیزوں کا تذکرہ ہے ان میں کچھ تولی جاتی ہیں اور کچھ ناپی جاتی ہیں۔ یہ چیزیں اگر ایک دوسرے سے بیچی جائیں تو برابر برابر ہونی چاہئیں اور دونوں پر فوراً قبضہ ہونا چاہیے۔ اس میں زیادہ کرنا یا زیادتی کا مطالبہ کرنا ربا ہے۔ گویا آیتِ کریمہ میں مطلق زیادتی مراد نہیں ہے، بلکہ مخصوص اشیاء میں مخصوص قسم کی زیادتی مراد ہے، جو ربا کہلاتی ہے۔

مرادِ قرآنی ایک چیز ہے اور بلاغتِ قرآنی دوسری چیز

اسی طرح کچھ حضرات دو چیزوں کو گڈمڈ کردیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے مرادِ قرآنی معلوم کرنا اور دوسری ہے وجوہِ اعجازِ قرآنی پر مطلع ہونا۔ آیاتِ قرآنی سے مراد کیا ہے؟ یہ ایک چیز ہے، اور ان آیات میں وجوہِ اعجاز کیا ہیں؟ یہ دوسری چیز ہے۔ اوپر جو دو مثالیں دی گئی ہیں اگر ان میں وجوہِ اعجاز نہ معلوم کیے جائیں اور اصولِ بلاغت (معانی، بیان، بدیع وغیرہ) سے کوئی بحث نہ کی جائے تب بھی رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ سے دونوں آیتوں کی مراد متعین ہوجاتی ہے۔ وصل، فصل، قصر، خطاب، التفات، ذکر، حذف، ابدال، خبر، انشاء، تقدیم، تاخیر، شرط، جزاء، عطف، حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ، تشبیہ، ابہام، ایضاح، تعمیم، تخصیص، ایجاز، اطناب، مساوات، فواصل وغیرہ کا تعلق علمِ بلاغت سے ہے۔ اس سے قرآن مجید کے وجوہ اعجاز کا پتا چلتا ہے۔ کلامِ عرب، خصوصاً

ادبِ جاہلی پر نظر رکھنے والا وجوہِ اعجاز پر پوری بصیرت کے ساتھ گفتگو کرسکتا ہے، لیکن مرادِ قرآنی تک ان کے بغیر بھی پہنچنا ممکن ہے۔ البتہ حدیث کو نظر انداز کرکے بسا اوقات مراد قرآنی تک پہنچنا ناممکن ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جن پانچ علوم کو نزولِ قرآن کا اصل مقصد و منشا قرار دیا ہے، ان کا حصول اور ان میں مہارت و بصیرت بھی مذکورہ اصولِ بلاغت پر منحصر نہیں۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید کے صریح مضامین پانچ علوم سے باہر نہیں نکلتے:

(۱) علم الاحکام: احکام سے مراد واجب، مندوب، مباح، مکروہ اور حرام ہے۔ خواہ وہ عبادات کے قبیل سے ہوں یا معاملات کے قبیل سے، یا تدبیر منزل سے، یا سیاستِ مدنیہ سے، اور اس علم کی تفصیل بیان کرنا فقیہ کے ذمہ ہے۔

(۲) علم الجدل: اور وہ چار گم راہ فرقوں کے ساتھ مباحثہ کرنا ہے، یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین۔ اس علم کی مکمل وضاحت متکلم کی ذمہ داری ہے۔

(۳) علم التذکیر بآلاء اللہ: اور وہ آسمان و زمین کی پیدائش کا بیان ہے، اسی طرح بندے جن چیزوں کے محتاج ہیں ان کو دل میں ڈالنے کا بیان، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کی وضاحت۔

(۴) علم التذکیر بایام اللہ: اور وہ ان واقعات کی وضاحت ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے، فرماں بردار بندوں کو نوازنے اور نافرمانوں کو سزا دینے کے قبیل سے ظہور پذیر فرمایا:

(۵) علم التذکیر بالموت و مابعدہ: یعنی موت، حشر و نشر، حساب، میزان اور جنت و دوزخ کا بیان۔

آخری تینوں علوم کی تشریح اور ان علوم سے تعلق رکھنے والی احادیث و آثار کو ذکر کرنا واعظ اور مذکّر کی ذمہ داری ہے''۔[۹]

یہ پانچوں علوم اپنی تشریح وتوضیح میں علم بلاغت کے محتاج نہیں ہیں۔لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان میں گہرائی وگیرائی اوران پر علیٰ وجہ البصیرۃ گفتگو کے لیے قدم قدم پر حدیث کی ضرورت پڑے گی۔

تفسیرِ قرآن کا صحیح طریقہ

تفسیرِ قرآن کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں دوسری آیات کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور یہ بھی تلاش کیا جائے کہ اس کے متعلق احادیث وآثار ہیں یا نہیں؟ اگر ہوں تو انھیں بھی دیکھا جائے۔ تعارض کی صورت میں تطبیق وتاویل کی کوشش کی جائے، ورنہ قرآن کو حدیث پر مقدم رکھا جائے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن کی تفسیر میں صرف قرآن پر اکتفا کیا جائے اور احادیث وآثار کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے، خواہ وہ آیت کے موافق ہوں یا ظاہراً مخالف۔ایک مومن کی دلی خواہش ہونی چاہیے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اس آیت کے سیاق وسباق میں نبی اکرم ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔

قرآن کی تفسیر کرتے وقت احادیث وآثار کی طرف نہ دیکھنا درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی 'مبیّن قرآن' کی حیثیت کو نظر انداز کر دینا ہے۔ دوسری خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ حدیث کے ظاہراً مخالف قرآن ہونے کی صورت میں اس کی تاویل وتوجیہ نہ کرنے یا اس کے ردّ وقبول کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنے سے یہ ذہن بنے گا کہ حدیثِ صحیح قرآن کے مخالف بھی ہوتی ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔صحیح رویہ یہ ہے کہ آیات قرآنی کی تفسیر میں اگر احادیث وآثار ہوں تو انھیں دیکھا جائے۔

پورا قرآن تواتر سے ثابت ہے، لیکن تواتر سے ثابت ہونے والی احادیث بہت ہی کم ہیں۔اس لیے راویوں کی تعداد اور ان کے حالات کے اعتبار سے احادیث کی درجہ بندی ہوگی اور اسی اعتبار سے ان سے استدلال واستنباط کی بنیاد رکھنا ہوگی۔

بسا اوقات حدیث کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا

تدریسِ قرآن میں احادیث سے استفادہ ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر

بسا اوقات قرآن کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

قرآن میں کیا ہے؟ اس کی تفصیل ہمیں حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

نزل القراٰن علیٰ خمسة أوجه: حلال و حرام و محكم و متشابه وأمثال، فاحلّوا الحلال وحرموا الحرام واعملوا بالمحكم و اٰمنوا بالمتشابه واعتبروا بالأمثال۔[۱۰]	قرآن پانچ وجہوں پر نازل کیا گیا ہے: حلال، حرام، محکم، متشابہ، امثال۔ پس حلال کو حلال سمجھو، حرام کو حرام سمجھو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور امثال سے عبرت حاصل کرو۔

پھر اسبابِ نزول کی معرفت احادیث کی معرفت پر موقوف ہے۔ کیفیت نزول، شانِ نزول، سب کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے۔ بعض آیات و الفاظ کی تشریح خود نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تک رسائی بھی حدیث سے استفادہ پر موقوف ہے۔ بعض آیات میں عہدِ نبوی میں پیش آمدہ بعض واقعات و حوادث کی طرف اشارہ ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے بھی احادیث سے استفادہ ضروری ہے، علامہ زرقانیؒ نے لکھا ہے:

سبب النزول هو ما نزلت الأية او الأيات متحدثة عنه او بينة لحكمه ايّام وقوعه والمعنیٰ انه حادثة وقعت فی زمن النبی ﷺ او سوال وجّه اليه فنزلت الأية او الأيات من الله تعالیٰ ببيان ما يتصل بتلك الحادثة او بجواب هذا السوال.[۱۱]	سبب نزول وہ ہے جس کے بارے میں آیت یا آیات نازل ہوئیں، یا اس کے ایامِ وقوع میں اس کے حکم کو ظاہر کیا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی واقعہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پیش آیا یا کوئی سوال آپ سے کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت یا آیتیں نازل ہوئیں جن میں اس واقعہ کا بیان ہے، یا اس سوال کا جواب ہے۔

حدیث قرآن کی شارح ہے، اس کے مجمل کی تفصیل ہے، اس کے مطلق کی مقیّد ہے، اس کے عام کی مخصّص ہے، اس کے مبہم کی مبیّن ہے، اس کے اسرار کی مظہر ہے۔[۱۲]

یحییٰ بن کثیرؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:

السنة قاضية على الكتاب، وليس الكتاب قاضياً على السنة۔[۱۳]

سنت کتاب کا فیصلہ کرنے والی ہے، کتاب سنت کا فیصلہ کرنے والی نہیں ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ جملہ قرآن کے مقام و مرتبہ کو کم کرتا اور سنت کے مقابلے میں اس کی حیثیت گھٹاتا ہے، اس لیے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے ذریعے قرآن و سنت کے باہمی تعلق کے ایک پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''اصل یہ ہے کہ قرآن سنت کا محتاج ہے، کیوں کہ سنت قرآن کی مبیّن ہے۔ اس کے مجملات کی تفصیل کرنے والی ہے، قرآن گویا ایک چھپا ہوا خزانہ ہے جسے ضرورت ہے کہ کوئی اسے آشکارا کرے، سنت اسے آشکارا کرتی ہے، یہی مطلب ہے اس بات کا کہ ''سنت کتاب کا فیصلہ کرنے والی ہے قرآن، سنت کا 'مبیّـن' نہیں ہے اور اس کا فیصلہ کرنے والا بھی نہیں۔ کیوں کہ وہ بذاتِ خود 'مبیّن' ہے، وہ قرآن کی طرح اعجاز و ایجاز کی حد تک نہیں پہنچی ہے، کیوں کہ سنت قرآن کی شرح ہے اور شرح کی شان یہ ہے کہ وہ مشروح سے زیادہ واضح اور صاف صاف ہو''۔[۱۴]

حدیث کے ذریعے قرآن کی وضاحت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) سورۂ انفال میں ہے:

وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِيْنَ (الانفال:۷)

اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمھیں ملے گی، تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کا حق ہونا عملاً ثابت کردے اور ان کافروں کی بنیاد کو قطع کردے۔

وہ دو جماعتیں کون تھیں جن میں سے ایک کا وعدہ مسلمانوں سے کیا گیا تھا، اور جس جماعت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ کون تھی؟ اور یہ وعدہ کہاں کیا گیا تھا؟ احادیث وآثار کی طرف رجوع کرنے سے ہمیں ان سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔

(۲) سورۂ توبہ میں ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئاً وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِيْنَ۔(التوبۃ: ۲۵)

لڑائی کی بہت سی جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب کہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہوگیا تھا، پھر وہ کثرت تمھارے لیے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی، پھر آخر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس آیت کو بھی ہمیں احادیث وآثار کی روشنی میں سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۳) سورۂ عبس میں ہے:

عَبَسَ وَتَوَلّٰى. أَن جَاءهُ الْأَعْمَى. وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى. أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَى. أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَى. فَأَنتَ لَهُ تَصَدّٰى۔(عبس: ۱-۶)

وہ چیں بہ جبیں ہوگئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا، اور آپ کو کیا خبر، شاید وہ آپ کی تعلیم سے پورے طور پر سنور جاتا، یا کسی خاص امر میں نصیحت قبول کرتا تو اسے وہ نصیحت فائدہ پہنچاتی، تو جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے آپ اسی کی فکر میں پڑتے ہیں۔

یہ آنے والے نابینا کون تھے؟ اور وہ کون لوگ تھے جن کی طرف رسول اللہ ﷺ اِن کے آنے کے وقت متوجہ تھے؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے ہمیں احادیث وآثار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

(۴) سورۂ احزاب میں ہے:

وَأَنزَلَ الَّذِيْنَ ظٰهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ مِن صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقاً تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيْقاً. وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضاً لَّمْ تَطَؤُوهَا۔ (الاحزاب:٢٦-٢٧)

اور جن اہلِ کتاب نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا۔ بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کرلیا۔ اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے قدم نہیں رکھا۔

اس آیت کریمہ میں جن اہل کتاب کا تذکرہ ہے وہ کون لوگ تھے؟ ان کی زمین و جائداد کہاں تھی؟ اور وہ زمین جہاں مسلمانوں کے قدم نہیں پہنچے تھے کون سی تھی؟ روایات سے صرفِ نظر کرکے یہ باتیں نہیں جانی جاسکتیں۔

فہم قرآن کے لیے حدیث کی ضرورت کہاں کہاں ہے؟

گذشتہ تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ قرآن فہمی کے لیے حدیث سے استفادہ ضروری ہے۔ درج ذیل صورتوں میں تدریسِ قرآن کے وقت حدیث سے استفادہ ضروی ہے:

١- غرائبِ قرآن اور مشکلاتِ قرآن کی مراد جاننے کے لیے: شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شرحِ غریب میں احسنِ طرق وہ ہے جو ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن ابی طلحہؒ کے طریق سے، پھر ضحاکؒ کے طریق سے، پھر نافع بن ازرق کے طریق سے مروی ہے۔ ١٥ شاہ صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ جو غرائبِ قرآن تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بالموت و مابعدہ سے متعلق ہیں، وہ احادیثِ کریمہ میں مزید اہتمام و تفصیل کے ساتھ بیان کردیے گئے ہیں۔ ١٦

٢- شانِ نزول سے واقف ہونے کے لیے: مثلاً وہ آیاتِ کریمہ جن میں کسی واقعہ، کسی سوال کا جواب، یا کسی تنبیہ وغیرہ کا ذکر ہو۔ اس قسم کی چند آیتیں یہ ہیں:

سورۂ انفال، آیت ٥ تا ١١ میں غزوۂ بدر کا واقعہ، سورۂ آل عمران آیات ١٥٢ تا

۱۵۵ اور ۱۶۵ تا ۱۶۸ میں غزوۂ احد کا واقعہ، سورۂ احزاب آیات ۹ تا ۲۵ میں غزوۂ خندق کا واقعہ، سورۂ فتح آیات ۱ تا ۱۰ و ۱۸ تا ۲۷ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ، سورۂ توبہ آیات ۷ تا ۲۴ اور ۳۸ تا ۴۲ میں فتح مکہ اور غزوۂ تبوک کا واقعہ، سورۂ احزاب، آیات ۳۶ و ۳۷ میں حضرت زینبؓ سے نکاح کا واقعہ، سورۂ نور آیات ۱۱ تا ۲۰ میں واقعۂ افک، سورۂ جن آیات ۱ تا ۱۹ میں جنات کے وفد کا رسول اللہ ﷺ کی تلاوت سننے کا ذکر اور سورۂ توبہ آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ میں مسجد ضرار کا قصہ وغیرہ۔

۳- اس تفسیر سے واقف ہونے کے لیے جو رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرامؓ سے منقول ہو، مثلاً آیاتِ کریمہ:

الَّذِيْنَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيْمَانَهُم بِظُلْمٍ۔ (الانعام:۸۲)	جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو 'ظلم' کے ساتھ مخلوط نہیں کیا۔

اس میں 'ظلم' کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے 'شرک' سے فرمائی اور استدلال میں آیتِ کریمہ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان:۱۳) کی تلاوت فرمائی۔[۱۷]

اور آیت کریمہ:

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهُ بِيَمِيْنِهِ. فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَسِيْراً۔ (الانشقاق:۷-۸)	اور بہر حال جسے اس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔

اس میں 'حِسَاباً يَّسِيْراً' کی تفسیر 'عرض' سے کی۔ یعنی صرف حساب پیش ہو جائے گا، کچھ کھود کرید اور پوچھ تاچھ نہ ہوگی۔[۱۸]

۴- ناسخ و منسوخ کی بحث سمجھنے کے لیے: یہ علوم قرآن کی ایک اہم بحث ہے۔ اس کی دو صورتوں کا براہِ راست تعلق حدیث سے ہے، **نسخ القرآن بالسنة، نسخ السنة بالقرآن**۔[۱۹]

نسخ القرآن بالسنة کا کیا مطلب ہے؟ یہ ایک طویل بحث ہے، جس کا یہاں موقع نہیں ہے، اس کے لیے علوم القرآن کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

ایک آیت کی کئی تاویلات؟

کچھ حضرات کو احادیث و آثار سے استدلال کرنے میں اس وقت اشکال ہوجاتا ہے جب ان کے سامنے ایک آیت کی کئی کئی تاویلات سامنے آتی ہیں۔ حالاں کہ یہ اشکال درست نہیں ہے۔ اگر کوئی لفظ دو مشترک معنوں میں ہوگا تو ہر معنیٰ کے اعتبار سے اس کی الگ الگ تاویل ہوجانا بدیہی امر ہے۔ یہ ذرا بھی قابل تعجب نہیں۔ عقلی اعتبار سے بھی اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے:

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوَءٍ ۔(البقرۃ: ۲۲۸)

مطلقہ عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین 'قروء'۔

یہاں 'قروء' سے کیا مراد ہے؟ 'قروء' دو معنوں میں مشترک ہے اور دونوں متضاد معنیٰ ہیں۔ ایک 'حیض'، دوسرے 'طہر'۔ اگر کوئی مجتہد وفقیہ، دونوں میں سے کسی ایک کو، اپنے تلاش کردہ آثار وقرائن کی روشنی میں، اور دوسرا، دوسرے معنیٰ کو، اپنی تحقیق وجستجو کے نتیجے میں، متعین ومشخّص کرے تو اس کو موجب طعن کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اور یہ چیز مورد الزام کیسے ہوجائے گی کہ ایک ہی آیت سے ایک نے 'حیض' اور دوسرے نے 'طہر' مراد لے لیا، جب کہ آیت خود ہی دونوں معنوں پر مشتمل ہے، لہٰذا آیتِ کریمہ میں نہ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض ہوسکتا کہ انھوں نے لفظ 'قروء' سے حیض کیوں مراد لے لیا؟ نہ امام شافعیؒ پر کہ انھوں نے 'طہر' کیوں مراد لے لیا؟ جو لفظ کئی معنوں میں مشترک ہوگا، آیت کریمہ کی مراد کو واضح اور متعین کرنے کے لیے تاویل وتوجیہ کے ذریعہ اس کا ایک معنیٰ متعین کرنا ہوگا، نہ کہ من مانے طریقہ پر دونوں معانی بتا کر آیت پر عمل کرنے کے سلسلے میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ بھلا یہ چیز قابلِ اشکال واعتراض کیسے ہوسکتی ہے؟! جب کہ خود نبی کریم ﷺ سے یہ ارشاد گرامی منقول ہے:

انزل القرآن علیٰ سبعة أحرف، لكل اية منها ظهر وبطن، ولكل حدّ مطلع ۔[۲۰]

قرآن، سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، ان میں سے ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہے، ایک باطن ہے اور ہر حد کے خبردار ہونے کی جگہ ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

''حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ ان (حروفِ سبعہ) میں سے ہر ایک کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کی ایک جائے اطلاع ہے، لہٰذا یہ جاننا مناسب ہے کہ ان علوم خمسہ کا ظاہر کلام الٰہی کا مدلول اور اسی کا منطوق ہے اور باطن ہے۔ الاء اللہ کی تذکیر میں اللہ کی نعمتوں میں خوب غور کرنا اور حق سبحانہ و تعالیٰ کا دل میں دھیان رکھنا اور ایام اللہ کی تذکیر میں ان قصوں سے مدح و ذم اور ثواب و عقاب کی علّت پہچاننا اور ان سے نصیحت حاصل کرنا اور جنت و جہنم کی تذکیر میں دوزخ کا خوف اور جنت کی امید ظاہر کرنا اور ان امور کو ایسا بنانا کہ گویا ان کو دیکھ رہا ہے۔ اور آیاتِ احکام میں کلام الٰہی کے مضامین اور مفاہیم سے مخفی احکام کا استنباط کرنا ہے اور فرق باطلہ کے مباحث میں ان قباحتوں کی بنیاد پہچاننا اور ان جیسی قباحتوں کو ان کے ساتھ ملانا ہے اور ظاہر کی جائے اطلاع کا مطلب عربی زبان کو جاننا اور ان آثار کو پہچاننا ہے جو علم تفسیر سے تعلق رکھتے ہیں اور باطن کی جائے اطلاع سے مراد ذہن کا عمدہ اور فہم کا درست ہونا ہے نورِ باطن اور دل کے سکون کے ساتھ''۔[۲۱]

مذکورہ بالا امور کے پیش نظر کسی آیت کی کئی تاویلات ہونا موجبِ حیرت یا باعث اشکال نہیں اور نہ ایسا ہونا خلاف عقل کہا جائے گا؟:

ایک آیت کی کئی شان نزول؟

بعض حضرات کو اس میں بھی اشکال ہوتا ہے کہ ایک آیت کی کئی کئی شانِ نزول احادیث و آثار سے ثابت ہوتی ہیں تو آخر کس شان نزول کو لیا جائے اور احادیث و آثار سے کیسے استدلال کیا جائے؟

اس کا جواب ڈاکٹر صبحی صالح نے اپنی کتاب 'علوم القرآن' میں تفصیل سے دیا ہے اور اس کے سارے وجوہ اور طریقۂ تطبیق و تاویل و ترجیح کو بھی بیان کر دیا ہے،[۲۲] لیکن

یہاں ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی گفتگو کو پوری تفصیل سے نقل کریں گے جو اس موضوع پر کافی وشافی ہے:

''فن تفسیر کے دشوار مقامات میں سے ایک اسبابِ نزول کا پہچاننا بھی ہے اور دشواری کی وجہ متقدمین ومتاخرین کی اصطلاحوں کا مختلف ہونا ہے۔

جو بات صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے کلام کا جائزہ لینے سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات 'نزلت فی کذا' کو صرف اس واقعہ کے بیان کے لیے نہیں لیتے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پیش آیا، بلکہ بسا اوقات وہ حضرات، آیت جن واقعات پر صادق آتی، اُن میں سے بعض واقعات کو ذکر کرتے، چاہے وہ واقعہ آں حضرت ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہو، یا اس کے بعد پیش آیا ہو، پھر کہتے تھے نزلت فی کذا (یہ آیت فلاں واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی)۔ اس صورت میں آیت میں ذکر کردہ تمام قیود کا منطبق ہونا ضروری نہیں، بلکہ صرف اصل حکم کا منطبق ہونا کافی ہوگا۔

کبھی صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام ایسا مسئلہ ذکر کرتے ہیں جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا، یا ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں پیش آیا ہو اور آپ نے اس مسئلہ یا واقعہ کا حکم آیت سے مستنبط فرمایا ہو اور اس آیت کو صحابۂ کرام کے سامنے اس سلسلے میں تلاوت فرمایا ہو تو وہ لوگ اس وقت نزلت کذا کہتے ہیں، اور بسا اوقات ان صورتوں میں وہ کہتے ہیں کہ فانزل اللہ قولہ کذا (پس اللہ تعالیٰ نے اپنا فلاں ارشاد نازل فرمایا) یا فنزلت (پس فلاں آیت نازل ہوئی)۔

یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کا اس حکم کو آیت سے مستنبط کرنا اور اس آیت کا اس وقت آپ کے قلب مبارک میں ڈالا جانا بھی وحی اور نفث فی الروع کی ایک قسم ہے، اس لیے فانزلت کہا جاسکتا ہے، اور اگر کوئی اس کو تکرارِ نزول سے تعبیر کرے تو اس کے لیے بھی گنجائش ہے۔

محدثین قرآن کریم کی آیتوں کے تحت بہت سی چیزیں ذکر کرتے ہیں۔ وہ چیزیں حقیقت میں اسبابِ نزول کے قبیل سے نہیں ہیں۔ مثلاً صحابہ کرام کا اپنے علمی مباحثوں میں

کسی آیت سے استدلال کرنا یا ان کا اس آیت کو نظیر میں پیش کرنا، یا آں حضرت ﷺ کا کسی آیت کو اپنے ارشاد گرامی میں استدلال کی غرض سے تلاوت کرنا، یا کسی ایسی حدیث کو نقل کرنا بنیادی مقصد میں، جو آیت کے موافق ہو، یا نزول کی جگہ کی تعیین کرنا، یا ان لوگوں کے ناموں کی تعیین کرنا جن کا آیت میں مبہم طریقہ پر تذکرہ کیا گیا ہے، یا قرآن مجید کے کسی کلمہ کے تلفظ کا طریقہ بیان کرنا یا قرآن پاک کی سورتوں اور آیتوں کی فضیلت بیان کرنا، یا قرآن مجید کے احکام میں سے کسی حکم پر رسول اللہ ﷺ کے عمل کا طریقہ بیان کرنا۔ پس ان میں سے کوئی چیز درحقیقت اسبابِ نزول میں سے نہیں ہے''۔۲۳

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ شانِ نزول کی اس قسم میں اجتہاد کو دخل ہے اور متعدد قصوں کی یہاں گنجائش ہے۔ جو شخص اس نکتے کو یاد رکھے گا وہ معمولی غور وفکر سے اسباب نزول کے اختلاف کو حل کر لے گا''۔۲۴

خلاصہ یہ کہ تفسیر کی کتابوں میں ایک ایک آیت کے تحت جو کئی کئی روایات لکھی ہوتی ہیں ان میں غور وفکر کی ضرورت ہے۔ وہ ساری روایات شان نزول سے متعلق نہیں ہوتیں۔ غور وخوض کے بعد پتا چل جاتا ہے کہ کون روایت اصل شانِ نزول ہے اور کون محض اس کا مصداق ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنی کتاب 'علوم القرآن' میں 'سبب نزول اور اختلافِ روایات' کے عنوان سے بڑی اچھی بحث کی ہے اور اس الجھن کو بڑے محققانہ انداز میں دور کیا ہے جو ایک ہی آیت کے سبب نزول میں کئی کئی مختلف روایتوں کے ملنے سے پیش آتی ہے۔۲۵

چند مشہور قرآنی مباحث میں حدیث سے استفادہ کی مثالیں

۱- قرآن مجید کا جب ہم پہلا ورق کھولتے ہیں تو ہماری نگاہ سب سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر پڑتی ہے، اور اس کے بعد متصلاً سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ ختم ہونے پر سورۂ بقرہ شروع ہوتی ہے، تو اس سے پہلے بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اسی طرح ہر سورہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی ہوئی ہے۔۲۶

تدریسِ قرآن سے وابستہ شخص جب یہ دیکھتا ہے تو اتنی بات فوراً اس کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو سورتوں کے شروع میں لکھی ہے وہ قرآن کا جزء تو یقیناً ہے، کیوں کہ مابین الدفتین سوائے قرآن کے اور کوئی چیز نہیں، لیکن کیا ہر سورت کے شروع میں لکھے ہونے سے وہ ہر سورت کا بھی جزء ہے۔؟ ۲۷

یہ مشکل اگر ہم غور کریں تو پہلے مرحلے پر ہی حل ہوجاتی ہے، کیوں کہ قرآن مجید کے پہلے صفحہ کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس کے معاً بعد سورۂ فاتحہ سے ہوا ہے اور سورۂ فاتحہ سے متعلق یہ حدیث نبوی موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

قال الله تعالیٰ قسّمت الصلوٰة بینی و بین عبدی نصفین ولعبدی ما سأل، فاذا قال العبد الحمد لله رب العالمین قال الله تعالیٰ حمدنی عبدی، واذا قال الرحمن الرحیم قال الله تعالیٰ اثنی علیّ عبدی، واذا قال مالک یوم الدین قال مجّدنی عبدی، واذا قال ایاک نعبد وایاک نستعین قال هٰذا بینی و بین عبدی ولعبدی ما سأل، فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین قال هذا لعبدی ولعبدی ما سأل۔ ۲۸

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندہ کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کردیا ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے۔ جب بندہ کہتا ہے الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی، پھر جب وہ کہتا ہے الرحمٰن الرحیم تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی، اور جب بندہ کہتا ہے مالک یوم الدین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ اور جب بندہ ایاک نعبد وایاک نستعین کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا۔ جب بندہ اہدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتا ہے، تو اللہ فرماتا ہے یہ میرے بندہ کے لیے ہے: اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔

اس حدیث میں سورۂ فاتحہ کی ایک ایک آیت کا تذکرہ ہے اور آغاز الحمد للہ رب العالمین سے کیا گیا ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت الحمد للہ رب العالمین ہے، نہ کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ورنہ آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا۔ گویا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو سورۂ فاتحہ کے شروع میں ہے وہ سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں ہے، بلکہ اس کا کچھ اور مقصد ہے۔ وہ مقصد ایک دوسری حدیث سے واضح ہوجاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

کان رسول اللہ ﷺ لایعرف فصل السورۃ حتی ینزل علیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔۲۹	رسول اللہ ﷺ سورتوں کا فصل نہیں جانتے تھے، یہاں تک کہ آپ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی تھی۔

گویا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مقصد سورتوں کے درمیان فصل کو ظاہر کرنا ہے کہ ایک سورہ ختم ہوگئی، اب دوسری شروع ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورتوں کا جزء قرار دے دیا جائے تو جہری نمازوں میں اگر کوئی سورہ شروع سے پڑھنا ہو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بھی جہراً پڑھنا پڑے گا، ورنہ اس کی پہلی آیت چھوٹ جائے گی۔ مثلاً فاتحہ پڑھتے وقت الحمد للہ رب العالمین سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جہراً پڑھنا ہوگی، تاکہ سورۂ فاتحہ کی کوئی آیت جہراً پڑھنے سے چھوٹ نہ جائے۔

۲-سورۂ مزمل میں ہے:

فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۔	پس پڑھو جو آسان ہو قرآن سے۔

(المزمّل: ۲۰)

یہ آیتِ کریمہ نماز میں قرآن پڑھنے سے متعلق ہے، گویا نماز پڑھنے والوں کو اجازت دی گئی ہے کہ انھیں قرآن کا جو حصہ پڑھنے میں آسان لگے پڑھ دیں، نہ کہ کوئی مخصوص سورہ، جس کا پڑھنا ضروری اور فرض ہو۔ یعنی مطلق قرأت قرآن فرض ہے، چنانچہ خود حدیث میں بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی حضرت خلاّدؓ بن رافع کو نماز کا طریقہ سکھاتے ہوئے فرمایا تھا:

اذاقمت الیٰ الصلوٰۃ فاسبغ الوضوء ثم استقبل القبلۃ فکبّر ثم اقرء بما تیسّر معک من القراٰن ۔۳۰	جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اچھی طرح وضو کرو، پھر قبلہ کی طرف رخ کر کے اللہ اکبر کہو، پھر قرآن میں سے جو تم سے ہو سکے، پڑھو۔

قرآن کی آیت اور حدیث دونوں میں 'ما' آیا ہے، جو کہ عام ہے، لہٰذا اس عموم کو چھوڑ کر کسی مخصوص سورہ کو فرض قرار دینا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن کچھ احادیث اس مضمون کی وارد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے، ورنہ نماز نہ ہوگی، مثلاً:

لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب. ۳۱ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بأم القراٰن فصاعداً. ۳۲ لاصلوٰۃ الا بقراء ۃ فاتحۃ الکتاب فما زاد. ۳۳ لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بالحمد و سورۃ فی فریضۃ او غیرھا. ۳۴ امرنا ان نقرء بفاتحۃ الکتاب وما تیسّر۔۳۵ وغیرہ۔

اب سوائے تاویل و توجیہ کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ چناں چہ یہ توجیہ کی گئی ہے کہ مطلق قرأتِ قرآن فرض ہے اور مذکورہ بالا احادیث کی وجہ سے سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

حواشی و مراجع

۱ ابن حجر عسقلانی، نزھۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر، طبع دیوبند، ص ۷۵

۲ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب أنزل القرآن علی سبعۃ أحرف، ۴۹۹۱، ۳۲۱۹؛ صحیح مسلم: ۸۱۹

۳ حوالہ بالا

۴ صبحی صالح، علوم القرآن، اردو ترجمہ غلام احمد حریری، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۴-۱۵۲

۵ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب مدّ القراءۃ، ۵۰۴۶

۶ شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب العمری التبریزی، مشکوٰۃ المصابیح، بحوالہ بیہقی، ۱/۱۹۱، کتاب فضائل القرآن

۷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب 'وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الأبیض من الخیط الاسود من الفجر' ۴۵۱۰، ۱۹۱۶، صحیح مسلم: ۱۰۹۰

۸ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذہب بالورق نقدا، ۱۵۸۴

۹ شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، مکتبہ حجاز دیوبند، ص ۱۶-۱۷
۱۰ مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۳۱، کتاب الإیمان فی الإعتصام بالکتاب والسنۃ، بہ حوالہ بیہقی۔
۱۱ الزرقانی، مناھل العرفان، دار احیاء الکتب العربیۃ، القاہرۃ، ۱/۹۹
۱۲ حوالہ بالا، ۱/۲۹۲
۱۳ حوالہ بالا ۱۴ حوالہ بالا، ۱/۲۹۲-۲۹۳
۱۵ الفوز الکبیر، ص ۴۹-۵۰ ۱۶ حوالہ بالا، ص ۱۱۷-۱۱۸
۱۷ صحیح بخاری، کتاب الإیمان، باب ظلم دون ظلم، ۳۲، صحیح مسلم: ۱۲۴
۱۸ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من سمع شیئا فراجع حتی یعرفہ، ۱۰۳، صحیح مسلم: ۲۸۷۶
۱۹ مناھل العرفان، ۲/۱۳۳-۱۴۲
۲۰ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، بحوالہ بیہقی، ۱/۳۵
۲۱ الفوز الکبیر، ص ۱۱۸-۱۱۹ ۲۲ علوم القرآن، ص ۲۰۲، ۲۱۲
۲۳ الفوز الکبیر، ص ۶۰-۶۱ ۲۴ حوالہ بالا، ص ۱۰۶-۱۰۷
۲۵ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، علوم القرآن، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سنہ طبع درج نہیں، ص ۷۶-۹۵
۲۶ سوائے سورۂ براءت (سورۂ توبہ) کے۔ اور اس کی ایک خاص وجہ ہے جس کا تذکرہ حضرت عثمانؓ نے کیا ہے، دیکھیے مشکوٰۃ، ۱/۱۹۴، بہ حوالہ ترمذی و ابوداؤد
۲۷ واضح رہے کہ یہ اس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ذکر نہیں ہے، جو سورۂ نمل آیت ۳۰ میں ہے، کیوں کہ وہ اس سورت کا جزء ہے۔
۲۸ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ۳۹۵
۲۹ مشکوٰۃ المصابیح، ۱/۱۹۳، کتاب فضائل القرآن، بہ حوالہ ترمذی، ابوداؤد، احمد۔
۳۰ صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب امر النبیؐ الذی لا یتم رکوعہ بالاعادۃ، ۶۲۵۱، صحیح مسلم: ۳۹۷
۳۱ صحیح بخاری، کتاب الأذان، باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی الصلوات کلہا فی الحضر والسفر ومایجہر فیہا ومایخافت، ۷۵۶
۳۲ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ۳۹۴
۳۳ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، ۸۲۰
۳۴ سنن الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی تحریم الصلاۃ وتحلیلہا، ۲۳۸
۳۵ سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، ۸۱۸

☆☆☆

دعوت وتبلیغ کے نبوی اسالیب

جناب محمد جنید انور

دعوت وتبلیغ کے اصول وآداب کے سلسلے میں قرآن وحدیث میں بنیادی باتیں مذکور ہیں۔ اس میدان میں سرگرم عمل رہنے والوں کے لیے رہ نمائی کا ایک اہم اور وسیع ذریعہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ سیرتِ نبوی کے قدیم وجدید لٹریچر میں اس موضوع پر خاصا مواد ملتا ہے کہ آپؐ نے یہ کارِ نبوت کیسے انجام دیا؟ اور اس کی ادائی میں کن اسالیب وآداب کو ملحوظ رکھا۔ دعوت کے موضوع پر اردو زبان میں جو چند کتابیں پائی جاتی ہیں، ان میں صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'اسلام کی دعوت' بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا شمار علمی و دینی حلقوں میں دعوتی لٹریچر کی زور دار اور مؤثر ترین کتابوں میں کیا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی مباحث 'رسولوں کا کام اور اس کی نوعیت' اور 'محمد ﷺ کا عظیم کارنامۂ دعوت' اور کتاب کے دیگر حصوں میں دعوتِ نبوی کے اسالیب پر اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ میں بھی اس موضوع پر بعض مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ (معاون مدیر)

دعوت وتبلیغ اسلام کا ایک اہم فریضہ پہلے بھی تھی، اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ فریضہ ہر ایک کلمہ گو مومن کی حیات اور اس کی ہستی کا مقصدِ وحید ہے۔ گزشتہ تمام انبیاء کرام کی بعثت کسی خاص قوم یا علاقے کی جانب ہوا کرتی تھی، لیکن خاتم النبیین ﷺ کی بعثت عام تھی اور آپ پر اتارا گیا دین آفاقی اور غیر زمانی ہے۔ اسی لیے اسلام کا دعوتی عمل ہر دور اور ہر حال میں جاری رہنا چاہئے، تاکہ اس کا پیغام ہر

دور میں تمام نسلوں تک پہنچ سکے۔ اس بات پر پوری دنیا کے مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ مگر یہ کام کیسے ہو؟ اور اس کے لیے کون سا منہج اور حکمت عملی اختیار کی جائے؟ اس بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔

ذیل کے صفحات میں دعوت وتبلیغ کی حکمت عملی کو نبوی ارشادات اور سیرت کی جھلکیوں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دعوت وتبلیغ کی اہمیت، سیرت نبوی کی روشنی میں

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو آپ ہمہ وقت داعی کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ایک جانب آپؐ عرب کے بازاروں میں (جو خاص ایام میں خاص علاقوں میں لگتے تھے اور عربوں کے باہمی تعلقات کی تجدید اور ملاقات و تبادلۂ خیالات کا اہم ذریعہ تھے) دعوت دین پھیلاتے ہوئے نظر آتے ہیں، دوسری جانب منیٰ میں لوگوں کے سامنے یہ اعلان کرتے ہیں: ''لوگو! اللہ عزوجل نے تمہیں یہ حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''۔ کبھی سوق ذی المجاز میں مجمع کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: ''**قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا**'' (**لا الہ الا اللہ** کہہ دو، فلاح یاب ہو جاؤ گے)۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپؐ خود اپنی ذات، سیرت اور کردار کے ذریعے اور اپنے روزمرہ کے معمولات اور اخلاق کریمانہ کی وساطت سے ہمہ وقت اسلام کے آفاقی پیغام کو خلق خدا تک پہنچانے میں مصروف رہے اور یہی اسوہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑا ہے۔ یہ صرف آپؐ ہی کی ذات اقدس ہے جس نے ایک ایک قبیلے کے پاس جا کر پیغام حق پہنچایا، مکہ سے مدینے ہجرت کی، تبلیغ دین کی پرامن آزادی حاصل کرنے کے لیے تلوار اٹھائی اور دوسرے ملکوں میں مبلغ بھیجے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے بار بار یہ ارشاد فرمایا: **اَلاھَل بلّغت؟** (کیا میں نے تم تک دین کا پیغام پہنچا دیا ہے؟) بعدازاں فرمایا: جو یہاں موجود ہے اسے غیر موجود تک پہنچانا چاہیے۔[۱]

آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

والذی نفسی بیدہ لتامرنّ بالمعروف ولتنھونَ عن المنکر ولیو شکنَ اللّٰہ ان یبعث علیکم عذاباً منہ فتد عونہ فلا یستجیب لکم۔[۲]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تمہیں نیکی کا حکم ضرور دیتے رہنا چاہئے اور برائی سے ضرور روکتے رہنا چاہئے، ورنہ عین ممکن ہے کہ اللہ تم پر اپنا عذاب بھیج دے، پھر تم اس کے دور ہونے کی دعا کروگے، مگر تمہاری دعا قبول نہ ہوگی۔

دعوت وتبلیغ کے نبوی اسالیب

تبلیغ و دعوت کے بنیادی طریقے یا اصول دراصل تین ہیں، جو قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں۔ پہلے طریقے کا نام حکمت، دوسرے کا موعظہ حسنہ اور تیسرے کا جدال بہ طریق احسن ہے۔ تبلیغ ودعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھایے گئے ہیں۔ مسلمان متکلمین فلاسفہ نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ ودعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں، یعنی اول: برہانیات، جن میں یقینی مقدمات کے ذریعے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں۔ دوم: خطابیات، جن میں موثر اور دل پذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے۔ سوم: مناظرات، جن میں عموماً علمی اور الزامی جوابات کے ذریعے اپنے موقف کو پیش کیا جاتا ہے اور دوسرے کو اس کا قائل کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے پہلے طریق کو حکمت، دوسرے کو موعظہ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے۔ استدلال کے یہی وہ طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

ذیل میں ان تینوں بنیادی اسالیبِ دعوت اور دیگر اسالیب اور نکات کا ذکر کیا جائے گا جنہیں سیرت طیبہ کی روشنی میں دعوت وتبلیغ کی حکمت عملی میں اہمیت حاصل ہے اور کوئی بھی داعی ان کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

۱۔ حکمت

حکمت ایک جامع اصطلاح ہے، اس کے تحت وہ تمام طرز ہائے عمل آجاتے ہیں جو مخاطب کو قبولِ حق پر آمادہ کریں۔ مثلاً موقع ومحل کا لحاظ، مخاطب کی نفسیات، عقلی استدلال وغیرہ[۳]۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پختہ اور اٹل دلائل و براہین کی روشنی میں نہایت حکیمانہ انداز سے لوگوں کو ان کی ذہنی استعداد اور موقع ومحل کو دیکھتے ہوئے اسلام کی دعوت اس طرح پیش کی جائے کہ مخاطب کے دل میں اتر جائے۔

بالفاظ دیگر حکمت دراصل یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے، بلکہ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے، جو اس کے دل ودماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں[۴]۔

۲۔ عمدہ نصیحت

عمدہ نصیحت یا موعظت حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیرخواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی کی خیرخواہی کی بات اس کے سامنے، نرم خوئی، اخلاص، ہمدردی، شفقت اور حسن اخلاق سے نہایت معتدل پیرائے میں کی جائے۔ اس سے اکثر پتھر دل بھی موم ہوجاتے ہیں اور لوگ ترغیب وترہیب کے مضامین سن کر بے تابی کے ساتھ دین حق کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ موعظت حسنہ داعی کے کلام میں وہ تاثیر پیدا کردیتی ہے جو دلوں کو پگھلا دیتی اور آنکھوں کو اشک بار کردیتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک بدو خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؐ صحابہ کرام کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ وہ بدو مسجد کے ایک کونے میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ نے دیکھا تو اسے روکنے کے لیے دوڑے اور سخت

سست کہنا شروع کر دیا۔ آپؐ نے انہیں اس سے منع کیا اور بدو کو مکمل طریقے سے حاجت پوری کر لینے دی۔ جب وہ فارغ ہوگیا تو آپؐ نے اسے بلایا۔ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابھی اس نے عذرخواہی کے لیے زبان بھی نہ کھولی تھی کہ رحمتِ دو عالم ﷺ نے اسے محبت اور ہم دردی سے فرمایا:

انّ هذه المساجد لا تصلح لشئ من هذا البول ولا القذر، انما هی لذكر اللّٰه عزّ وجل والصلاة وقراءة القرآن۔[۵]

یہ مساجد ہیں۔ ان میں گندگی اور پلیدی مناسب نہیں ہے۔ یہ تو صرف نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔

۳۔ مجادلۂ احسن

مجادلہ سے مراد بحث ومناظرہ ہے۔ دعوتی امور میں پہلے تو اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کسی مناظرے اور مباحثے کی ضرورت نہ پڑے (الحج: ۶۷-۶۹) اور اگر مناظرہ کرنا ہی پڑے تو اچھے اور احسن طریقے سے کیا جائے۔ 'بہ طریق احسن' سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کبھی بحث ومناظرے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ اچھے طریقے سے ہونا چاہئے۔ علامہ آلوسی نے لکھا ہے: ''اچھے طریقے سے مراد یہ ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کئے جائیں جنھیں مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور ومعروف ہوں، تاکہ مخاطب کے شکوک دور ہوں اور وہ ہٹ دھرمی کے راستے پر نہ پڑ جائے۔[۶]

۴۔ نرمی سے بات کرنا

داعی کو ہر موقع پر نرمی اور خیر خواہی سے بات کرنی چاہئے۔ بلاشبہ حق میں نرمی سے کام لینا نہایت ضروری ہے۔ آں حضرت ﷺ میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ حضرت مالک بن حویرثؓ بیان کرتے ہیں:

كان رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم رحيما رقيقا۔[۷]

رسول اللہ ﷺ رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔

رحم دلی، نرمی اور رقتِ قلب اچھے انسان کی بنیادی صفات میں سے ہیں۔ ہرطرح کی اچھائی و بھلائی اس سے وابستہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشادمبارک ہے:

من یحرم الرفق یحرم الخیر ۸ جوشخص نرمی سے محروم ہے وہ بھلائی سے محروم ہے۔

ایک اور روایت میں آپؐ نے نرمی کو اللہ تعالیٰ کی صفت قرار دیا ہے۔ فرمایا:

ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف وما لا یعطی علی ماسواہ۔ ۹ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرم خوئی پر انسان کو وہ کچھ عطا کرتا ہے جو نہ سختی پر عطا کرتا ہے نہ اس کے سوا کسی اور چیز پر۔

یہ احادیث مبارکہ دعوتِ اسلام کے حوالے سے بھی نرمی اور نرم دلی کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ جو لوگ اصلاح وتبلیغ اور رشد و ہدایت کے سلسلے میں سرگرم ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نرم دلی، خوش طبعی، عفو و درگزر، تلطّف ومہربانی اور حسن خلق کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں اور قساوت قلبی، سختی و درشتی اور شدت جیسی صفات سے دور رہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جب آپؐ نے دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں نرم خوئی اور رحم دلی کا مظاہرہ کیا۔

۵۔ تدریج کا لحاظ

تدریج کا مطلب یہ ہے کہ داعی یک بارگی شریعت کے تمام احکام کا بوجھ مخاطب کی گردن پر نہ لاد دے، بلکہ آہستہ آہستہ اس کے سامنے سارے احکام پیش کرے۔ پہلے توحید ورسالت اور دیگر عقائد کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو۔ عبادات میں بھی اہم تر پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوۃ اور دوسرے فرائض ہیں۔ نبی ﷺ نے دعوت وتبلیغ میں ہمیشہ تدریج کا لحاظ رکھا اور دوسروں کو بھی اصولِ تدریج کی تلقین فرمائی۔ حکمتِ تبلیغ کے ضمن میں داعی کا فرض ہے کہ تدریج کے پہلو کو نظر انداز نہ کرے۔ یہ اصول فرد اور قوم دونوں

کے لیے ضروری ہے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

إنک ستأتی قوماً من أهل کتاب فاذا جئتهم فادعهم الی أن یشهدوا أن لاالہ الااللہ وأن محمد اًرسول اللہ ﷺ فان هم اطاعوا لک بذٰلک فأخبر هم أن الله قد فرض علیکم خمس صلوات فی کل یوم ولیلة فان هم اطاعوا لک بذالک فأخبرهم أن الله قد فرض علیکم صدقة تؤخذ من اغنیائهم ، فتردّ علی فقرائهم ، فإن أطاعوا لک بذلک، فایاک و کرائم اموالهم، واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینه و بین الله حجاب.[۱۰]

عن قریب تم اہل کتاب کی ایک قوم کے پاس پہنچو گے۔ جب تم ان کے پاس پہنچو تو سب سے پہلے ان کو یہ دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ اس میں تیری اطاعت کرلیں تو ان کو یہ بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ تیری یہ بات بھی مان لیں تو ان کو اس بات کی اطلاع کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے صدقہ فرض کیا ہے۔ یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا اور جب وہ اس کو بھی تسلیم کرلیں تو دیکھو کہ ان کا عمدہ مال چن چن کر نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ (رکاوٹ) نہیں ہے۔

۶۔دعوت کی ترتیب

دعوت وتبلیغ کے لیے جہاں حکمت و تدبیر کی ضرورت ہے وہاں ترتیب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، ورنہ اصلاح کے بجائے بگاڑ اور انتشار کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید نے دعوت کی جو فطری ترتیب بیان کی ہے اس میں سب سے پہلا مخاطب خود انسان کی اپنی ذات ہے۔ (الصّف:۳) اس کے بعد اس بھلائی اور خیر کے سب سے زیادہ حق دار اس کے بیوی بچے ہیں (التحریم:۶) اور اس کے بعد عزیز واقارب اور بالآخر پوری دنیا دعوت کی مخاطب ہے (الشعراء:۲۱۴) رسول اللہ ﷺ نے دعوتِ دین

میں اس ترتیب کو ملحوظ رکھا۔ دعوت ہر کارکن کو متنبہ کرتی ہے کہ اس کے قول وفعل میں تضاد نہیں ہونا چاہئے اور اسے اپنے کردار کی حفاظت کرنی چاہئے، کیونکہ لوگ اس کی چال ڈھال، کردار، گفتار، غرض اس کی ہر حرکت کو اپنے لیے نمونہ اور سند سمجھتے ہیں۔

۷۔ انسانی نفسیات کی رعایت

انسانی نفسیات کی رعایت کے بغیر دعوت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے، اسی لیے آں حضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کو دعوت کے سلسلے میں عمومی طور پر مدعو کے حالات ونفسیات کی رعایت کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

یسّروا ولا تعسّروا ، و بشّروا ولا تنفّروا۔[۱۱]	لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، ان پر تنگی مت کرو، اور انہیں خوش خبریاں سناؤ، متنفر نہ کرو۔

آپؐ نے داعیان حق کے لیے صحیح طرز عمل کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا:

انما بُعثتم میسّرین ولم تُبعثوا معسّرین [۱۲]	تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

لہٰذا دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں داعی کو اس اسلوب نبوی کی اتباع از حد لازم ہے کہ وہ جس ماحول میں فریضۂ دعوت انجام دے اس کے افراد کی نفسیات اور طبائع کا لحاظ رکھے، اس کی رعایت سے تبلیغ و دعوت کے عمل میں زبردست اثر انگیزی رؤنما ہوتی ہے اور وہ مزید طاقت ور ہو کر سامنے آتا ہے۔ گویا دعوت کی کامیابی میں مرکزی کردار داعی کا ہے۔ وہ جس قدر تربیت یافتہ اور انسانی نفسیات کا عالم ہوگا اسی قدر اس کی دعوت موثر ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے موثر ہونے کی ایک اہم وجہ آپؐ کا ذاتی کردار تھا تو دوسری بنیادی وجہ آپؐ کا اسلوبِ دعوت تھا۔ آپؐ نے ہمیشہ مخاطبین کی ذہنی استعداد، میلانات، رجحانات اور ان کے خاندانی وعلاقائی پس منظر کو سامنے رکھ کر دعوت کا کام کیا۔ سیرتِ طیبہ کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا کوئی متعین طریقِ دعوت نہ تھا، بلکہ مخاطبینِ دعوت کے تبدیل ہونے کے ساتھ ہی آپؐ کا اسلوبِ دعوت بھی تبدیل ہو جاتا تھا۔ایک جاہل ، ان پڑھ اور اجڈ مخاطب کو دعوت کا انداز پڑھے لکھے اور شہر کے رہنے والے فرد سے مختلف ہوتا تھا۔

۸۔مدعو کے عقائد سے واقفیت

داعی کا فرض ہے کہ دعوت اور مخاطب کے عقائد وافکار کے درمیان قدر مشترک تلاش کرے اور ان کی درست باتوں کو دعوت کی بنیاد بنائے ۔اگر اس اسلوب کو اختیار کیا جائے تو مخاطب کو دعوت سے مانوس کرنے میں مدد ملتی ہے اور مخاطب سمجھتا ہے کہ جو دعوت اس کے سامنے پیش کی جارہی ہے وہ کوئی بالکل ہی نئی اور اجنبی چیز نہیں ہے اور نہ اس سے کسی نئی چیز کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔حضرت حاطبؓ نے مقوقس شاہ مصر کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ''ہم تمہیں دین مسیح سے روکتے نہیں ہیں، بلکہ ہم تو اسی کا حکم دیتے ہیں'' ۱۳؎ یہ اس اسلوبِ دعوت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

۹۔فطری کم زوری کا لحاظ

حکمتِ تبلیغ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے داعی کا فرض ہے کہ وہ اگر کسی فرد یا قوم کو کسی گناہ میں مبتلا دیکھے تو اس کی فطری کم زوری کا لحاظ کرتے ہوئے اصلاح کی کوشش ترک نہ کرے، بلکہ اس کے ساتھ حقیقت پر مبنی رویہ رکھے کہ انسان فطری طور پر لاعلمی، غفلت ،خواہش نفس اور نسیان جیسے عوارض کا شکار ہوکر گناہ میں مبتلا ہوسکتا ہے ۔گناہ سے متعلق انسان کی فطری کم زوری کا خیال کرتے ہوئے سختی کے بجائے نرم اور مشفقانہ رویہ اختیار کرنا چاہئے ،اس لیے کہ گناہ گار کے بجائے گناہ سے نفرت کرنا عقل کا تقاضا ہے اور داعی کا کام اصلاح اور جوڑنا ہے نہ کہ انتقام اور توڑنا۔آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

کل بنی آدم خطّاء و خیر الخطّائین التوّابون ۱۴؎	تمام بنی آدم خطاکار ہیں ،اور بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرلیتے ہیں۔

۱۰۔ جبر و اکراہ سے اجتناب

نبی کریم ﷺ نے دین اسلام کی دعوت و تبلیغ میں کبھی جبر و اکراہ اور زبردستی کا راستہ اختیار نہیں کیا اور اپنے صحابہ کو بھی اس سے منع فرمایا۔ کیونکہ اسلام دینِ فطرت ہے اور ہر انسان فطری طور پر اسلام کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہے۔ نیز ایمان اسلام کا اہم ترین جزو ہے اور ایمان یقین کا نام ہے۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت کسی انسان کے دل میں یقین کی معمولی سی مقدار بھی زبردستی پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لیے دین اسلام کی واضح ہدایت ہے:

لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں زبردستی نہیں ہے، تحقیق ہدایت گم راہی سے الگ ہوچکی ہے۔

درس گاہ نبوی کے فیض یافتہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

حدّثِ الناس كل جمعة مرة، فان أبيت فمرتين، فان اكثرت فثلاث، فلا تملّ الناس هذا القرآن ولا الفينَّک تأتي القوم وهم في حديث من حديثهم فتُقصّ عليهم فتقطع عليهم حديثهم فتملّهم، ولكن انصت، فاذا أمروک فحدّثهم و هم يشتهونه۔[۱۵]

لوگوں کو جمعہ جمعہ دین کی بات سنایا کرو، اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دو بار، اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین بار اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کرو۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم لوگوں کے پاس ایسے وقت میں جاؤ جب وہ اپنی کسی اور دلچسپی میں ہوں اور اس وقت ان کو دین کی بات سنانا شروع کردو، جس سے ان کی مصروفیات میں رکاوٹ آجائے اور اس کے نتیجے میں ان میں بے زاری پیدا ہو۔ بلکہ ایسے موقع پر خاموش رہو، یہاں تک کہ لوگ تم سے خواہش کریں تب ان کو سناؤ، تاکہ وہ تمہاری بات رغبت سے سنیں۔

۱۱۔ذہنی آمادگی

دعوت وتبلیغ کے لیے ذہنی آمادگی اولین شرط ہے۔جب کوئی شخص کسی مسئلہ کو جاننے کی کوشش کرے یا اس کا دل اس کی طرف متوجہ ہو، اس وقت مسئلہ بتانے سے اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور وہ بات پختگی سے ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ اس لیے کارِدعوت میں مشغول ہر شخص کو مخاطب کی ذہنی آمادگی کا لحاظ رکھنا چاہیے، تاکہ اس کی دعوت مؤثر ہو۔ درس گاہ نبوی سے علم کی کرنیں حاصل کرنے والے نفوس قدسیہ بھی اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ علم اور دعوت ہر کسی کو نہ دی جائے، بلکہ اس کے لیے مدعو کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے اور اس میں طلب اور آمادگی دیکھنے کے بعد ہی اسے علم اور دین کی دعوت دی جائے۔[۱۶]

۱۲۔اچھے اخلاق کا مظاہرہ

حسن خلق بھی ایمان کے ان شعبوں میں سے ہے، جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہے، اگرچہ اس کے اثرات، ثمرات و برکات سے خود صاحب اخلاق ہی سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ حسن اخلاق کے اتنے عظیم مرتبے پر فائز تھے کہ خود قرآن نے اس کی گواہی دی ہے:

اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم:۴) آپ تو بلاشبہ خلق عظیم پر فائز ہیں۔

آپؐ نے اخلاق حسنہ پر اس قدر زور دیا ہے کہ اسے اپنی بعثت کا ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، فرمایا:

بُعثت لاتمّم حسن الاخلاق۔[۱۷] میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے آں حضرت ﷺ سے حاضری کی اجازت چاہی، آپؐ نے فرمایا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا بہت برا آدمی ہے، پھر اسے حاضری کی اجازت دے دی اور اس کے اندر آنے پر اس کے ساتھ نہایت

نرمی سے باتیں کیں۔ جب وہ شخص چلا گیا تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ آپؐ نے پہلے تو اس کے بارے میں یہ کچھ ارشاد فرمایا تھا، مگر پھر اس سے اس قدر نرمی کے ساتھ بات چیت کی، یہ کیا بات ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

یا عائشة انّ من شرّ الناس من ترکه الناس او ودعه الناس اتّقاء فحشه۔[۱۸]	اے عائشہ! لوگوں میں سے بدترین شخص وہ ہے، جسے لوگ اس کی بدکلامی کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

۱۳۔ مناسب وقت کا انتظار

یہ بات بھی حکمت تبلیغ کے خلاف ہے کہ دعوت کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ وہ لوگوں کے لیے بوجھ بن جائے اور وہ اس سے گھبرانے لگیں۔ دعوت دین کے ہر کارکن کو اپنے گردوپیش کا پوری ہوشیاری اور مستعدی سے جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے جیسے ہی مناسب موقع ہاتھ آئے وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! ہماری خواہش ہے کہ آپ روزانہ نصیحت کیا کریں۔ انہوں نے کہا: میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت سناتا ہوں، جس طرح رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے، تاکہ ہم بیزار نہ ہو جائیں۔[۱۹]

۱۴۔ تالیف قلب

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلاَوانّ فی الجسد مضغة اذا صلُحت صلُح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله، الاوهی القلب۔[۲۰]	آگاہ رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ سنور جاتا ہے تو تمام بدن سنور جاتا ہے۔ اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو تمام بدن خراب ہو جاتا ہے۔ سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔

اس حقیقت سے مفر نہیں کہ دل انسانی جذبات کا مرکز ہے۔ داعی جب مدعو کے دل کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ یقینی طور پر اسے صراطِ مستقیم پر گام زن کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے کئی شدید ترین دشمنوں کو محض تالیف قلب کے ذریعے حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔ آپؐ نے غزوۂ حنین میں ملنے والے مال غنیمت کو رؤساء مکہ میں ان کی تالیف قلب کی خاطر تقسیم کر دیا۔ چنانچہ مکہ کے کئی سرداروں نے اسی جذبے سے متاثر ہو کر صدق دل سے اسلام قبول کر لیا۔ صفوان بن امیہ، جو زمانۂ جاہلیت میں اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے جانی دشمن تھے، فرماتے ہیں:

واللہ لقد اعطانی رسول اللہ ما اعطانی، وانہ لأبغض الیّ، فما برح یعطینی حتی إنّہ لأحبّ الناس الیّ۔ [۲۱]	اللہ کی قسم! رسول اللہؐ نے مجھے اتنا دیا جس کی کوئی حد نہیں، جب کہ مجھے آپؐ سے سخت بغض تھا، آپؐ مجھے دیتے رہے یہاں تک کہ آپؐ مجھے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہو گئے۔

۱۵۔ مدعو کی خیر خواہی

داعی کی حیثیت ایک مہربان استاد اور مربی کی سی ہوتی ہے۔ اس کا اپنے مخاطبین سے ایسا رویہ، جس میں خیر خواہی، اپنائیت، محبت اور حوصلہ افزائی کا رنگ نمایاں ہو، دعوت کی کامیابی میں اولین پتھر کا کام دے سکتا ہے۔ یہی چیز بسا اوقات مدعو کو داعی کے اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ اس کے بعد دعوت کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: **الدین النصیحۃ.** (دین تو خیر خواہی کا نام ہے)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: کس کی خیر خواہی؟ آپؐ نے فرمایا:

للّہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامّتھم۔ [۲۲]	اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے حاکموں کی اور عام مسلمانوں کی۔

ہم دردی اور خیر خواہی کی صفات اسلام کی مسلّمہ اخلاقی تعلیمات میں سے ہیں۔ اس کا خلاصہ وہی ہے، جو نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے الدین النصیحۃ کے ذریعے بیان فرمایا کہ پورا دین اسلام ہی خیر خواہی کا نام ہے: اپنی خیر خواہی، اپنے متعلقین کی خیر خواہی، اپنے حکم رانوں اور ماتحتوں کی خیر خواہی، پھر دین اسلام کی، اس کے شعائر وعلامات اور متعلقات کی خیر خواہی اور پھر عامۃ الناس کی، اللہ کی ساری مخلوق کی خیر خواہی۔ یہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے اور ان ہی پر عمل پیرا ہونے کی اسلام تلقین کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو آں حضرت ﷺ نے دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

الخلق کلّھم عیال اللہ، فأحبّ الخلق الی اللہ من أحسن الی عیالہ. ۲۳	تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

اس حدیث میں بھی نبیٔ اکرم ﷺ نے تمام مخلوق کی خیر خواہی، ان سے ہم دردی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین فرمائی ہے۔ خیر خواہی کا یہ آفاقی جذبہ ہی دراصل اسلامی اخلاقیات کی اساس، معاشرت کی جان اور دعوت وتبلیغ کی شان ہے۔

۱۶۔ مختصر اور دل نشیں بیان

دعوت وتبلیغ کو موثر بنانے کے لیے مضامین دعوت کا واضح، دوٹوک اور مختصر ہونا بھی ایک بہترین اسلوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دعوتی وتبلیغی خطبات میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ ایجاز واختصار کی جھلک بڑی نمایاں ہوتی تھی۔ آپؐ دعوتی عمل میں مصروف حضرات صحابہ کو مختصر بات اور خطبے کی ترغیب دیتے اور خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے۔ ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے ہمیں مختصر، لیکن فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ لوگوں نے ان کے بیان کی خوب تعریف کی اور ساتھ ہی یہ بھی خواہش کی کہ کچھ مزید بیان فرمائیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

ان طول صلاة الرجل وقصر خطبته مئنة من فقهه، فاطيلوا الصلوة واقصروا الخطبة۔[۲۴]

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ نماز کو طول دینا اور خطبہ کو مختصر کرنا انسان کی سمجھ کی علامت ہے، پس تم نماز کو لمبا کرو اور خطبہ مختصر دیا کرو۔

مسجّع اور مقفّی عبارتوں اور ان کی خاطر گفتگو کو طول دینے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

انظر السجع من الدعاء فاجتنبه، فاني عهدت رسول الله ﷺ وأصحابه لايفعلون ذلک ۔[۲۵]

دعاؤں میں عبارتیں مسجع نہ کرو، میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب ایسا کرنے سے بچتے تھے۔

۱۷۔ مدعو کی زبان سے واقفیت

عرب اگر چہ عربی زبان بولتے تھے، لیکن ان کے مختلف قبائل اور علاقوں میں لہجوں کا اختلاف پایا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بہت سے قبائل کے وفود آتے اور اسلام قبول کرتے تو آپؐ ان کے ساتھ ان ہی کی زبان اور لہجے میں گفتگو فرماتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابلاغ اور تفہیم کے لیے زبان کی اہمیت مسلم ہے۔ دعوت و تبلیغ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے، جب پیغام کی زبان آسان، نرم اور قابل فہم ہو، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ داعی مدعو کی زبان سے بھی واقفیت رکھتا ہو تو دعوت کا کام مزید آسان ہوجاتا ہے، کیونکہ ہم زبانی سے انسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہوتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس اسلوب کو اختیار فرمایا تھا۔ خطیب بغدادی نے اپنی سند سے کعب بن عاصم الاشعری کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اشعریوں کے مخصوص لہجے میں بات کرتے سنا۔ اشعریوں کی لغت میں لام میم سے تبدیل کر لیا جاتا ہے۔[۲۶] آپؐ نے اپنے لہجے کو چھوڑ کر مخاطب کے لہجے کو اختیار فرمایا۔ اس عمل

سے مدعو پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور اسے اپنائیت اور قربت پیدا ہوتی ہے۔اسی ضرورت کے پیش نظر آپؐ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا، تاکہ یہود سے انہی کی زبان میں گفتگو کی جا سکے اور انہی کی زبان میں ان کے خطوط کا جواب دیا جا سکے۔

۱۸۔عزّتِ نفس کی رعایت

اگر داعی غلطی کرنے والے کو براہ راست مخاطب کرنے کے بجائے اشارے کنایے میں اس کی غلطی کو واضح کرتا ہے تو اس صورت میں غلطی کرنے والے کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی۔ دعوت کا یہ اسلوب اس وقت موثر ہوتا ہے جب مخاطب کی غلطی عام لوگوں سے پوشیدہ ہو،لیکن اگر اکثر لوگوں کو اس کا علم ہو اور اسے معلوم ہو کہ اکثر لوگ یہ بات جانتے ہیں تو اس صورت میں دعوت وتبلیغ کا یہ اسلوب سخت زجروتوبیخ کا حامل اور غلطی کرنے والے کے لیے رسوائی کا باعث بن جاتا ہے۔اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ اس کو براہ راست سرزنش کر دی جائے اور یہ اسلوب اختیار نہ کیا جائے۔ اگر بات بھلائی اور خیر خواہی کے جذبے سے کی جائے تو یہ ایسا انداز تربیت ہے جس سے غلطی کرنے والے کو بھی فائدہ ہوتا ہے۔ایسے ہی ایک موقع پر نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

یااھل مکۃ !ماشان النّاس یاتُون شُعثاً وانتم مدّھنون؟ اھلُّوا اذارأیتم الھلال [۲۸]	اے اہل مکہ !کیا بات ہے کہ لوگ جب تمھارے پاس آتے ہیں تو ان کے بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور تم تیل لگاتے ہو؟تم چاند دیکھ کر احرام باندھ لیا کرو۔

اس اسلوب دعوت کا قلبِ انسانی پر گہرا اثر ہوتا ہے اور انسان فوراً اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔اس سے غلطی کرنے والے کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی،جس کی وجہ سے غلطی کرنے والے کے دل میں داعی اور نصیحت کرنے والے کی قدر ومنزلت اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۹۔ تمثیل وقصص سے معاونت

مخاطب کو دعوت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے قصوں اور کہانیوں کی زبان میں بات کرنا انسانی نفسیات کا ایک عمدہ اسلوب ہے، کیونکہ قصوں اور کہانیوں کے پیرائے میں اگر بات کی جائے تو مخاطب واقعات کا تسلسل جاننے کے لیے ہمہ وقت داعی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ دور قدیم سے ہی تمام معاشروں میں یہ ایک معروف چیز رہی ہے۔ قرآن حکیم نے بھی لوگوں کی اس فطرت کو جانتے ہوئے قصص کو بہ طور ذریعۂ تربیت و دعوت اختیار کیا ہے۔ مکالمانہ انداز اور سوال و جواب کا اسلوب مخاطب کے ذہن وفکر کو متوجہ کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے انتہائی اختصار کے ساتھ قصص اور واقعات کی دعوتی اور تربیتی تاثیر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِي قِصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (یوسف:۱۱۱) بے شک ان کے قصوں میں اہل فہم کے لیے بڑی عبرت ہے۔

واعظانہ اسلوبِ دعوت کے مقابلہ میں یہ اسلوب زیادہ اثر انگیز ہے، کیونکہ اس صورت میں متکلم اور سامع کے درمیان براہ راست گفتگو ہوتی ہے اور حقائق کو ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب کے ذہن میں بٹھا دیا جاتا ہے۔

۲۰۔ مداومتِ عمل

تعلیمات نبوی کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلام میں اعتدال اور مداومتِ عمل دونوں کی تاکید کی گئی ہے۔ مداومتِ عمل وہ راستہ ہے جو اعتدال کی منزل پر منتج ہوتا ہے اور اعتدال اسلام کی نظر میں ہر معاملے میں پسندیدہ ہے۔

کسی بھی کام کی ایک ترتیب ہے۔ مسلسل ایک معمول کے طور پر نیک نیتی کے ساتھ کام کرنے سے انسان کے مزاج میں توازن بھی پیدا ہوتا ہے اور اس میں استقامت جیسی مفید اور مطلوب صفت بھی پروان چڑھتی ہے۔ یہ عمل کی ایک اضافی

خوبی ہے، اس لیے کسی کام میں مداومت جہاں اس بنا پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ اس کی تاکید کرتا ہے، وہیں ایک اچھا انسان بننے کے لیے بھی یہ صفت نہایت ضروری ہے۔ آپ ؐ کا فرمان مبارک ہے:

إنّ أحبّ الأعمال الی اللہ أدومھا وإن قلّ [۲۹] — اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، خواہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

معلوم ہوا کہ دعوت جیسے عظیم الشان عمل کے لیے مداومت لازمی ہے۔ یہ اس میدان میں کامیابی کا مرکزی نکتہ ہے۔ ورنہ اگر داعی کسی مرحلے میں ہمت ہار جائے یا حالات کے آگے سپر ڈال دے تو دعوت کا کام وہیں رک جائے گا۔

۲۱۔ مباحثے میں شائستگی کا لحاظ

اپنے نکتہ کی وضاحت اور اس کے حق میں دلیل دیتے وقت بعض اوقات مباحثہ ضروری ہوجاتا ہے، لیکن بحث و مباحثہ عمدہ طریقہ سے اور شائستگی کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ اگر بات دلائل اور براہین کی روشنی میں کی جائے تو وہ مؤثر ہوگی، کیونکہ انسان کی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ دلیل سے متاثر ہوتا ہے اور جو بات وہ دلیل کے بغیر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس کو مضبوط دلیل کی موجودگی میں تسلیم کر لیتا ہے۔ ابنِ اثیر کی روایت ہے کہ جب حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ رسول اللہ ﷺ کا گرامی نامہ لے کر مقوقس شاہ مصر کے دربار میں پہنچے تو دونوں کے درمیان حسب ذیل مکالمہ ہوا:

مقوقس: مجھ سے اپنے صاحب کی حالت بیان کرو، کیا وہ نبی ہیں؟

حاطبؓ: ہاں! بے شک وہ اللہ کے رسول ہیں۔

مقوقس: پھر انہوں نے اپنی قوم پر بددعا کیوں نہیں کی؟ جبکہ ان کی قوم نے ان کو ان کے شہر سے نکالا۔

حاطبؓ: عیسیٰ بن مریمؑ کی نسبت تو آپ خود کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، پھر جب ان کی قوم نے ان کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے کیوں نہ انہیں

بددعا دی۔ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا؟

مقوقس : تم نے اچھا جواب دیا۔تم حکیم ہو اور حکیم کے پاس سے آئے ہو۔[۳۰]

کسی بات کے موثر ابلاغ وافہام کے لیے جس طرح انسان کی نفسی کیفیات، جسمانی حالا ت اور علاقائی نفسیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اسی طرح اس کے عقلی، ذہنی اور فکری رجحانات ومیلا نات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔دین اسلام ساری دنیا کے لیے اور سب انسانوں کے لیے ہے،لیکن اسے پیش کرنے اور اس کو سب انسانوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مخاطب و مدعو کا تعین کیا جائے، یہ دیکھا جائے کہ اس خطاب اور دعوت کا رخ اس کے ماننے والوں کی طرف ہے یا انکار کرنے والوں کی طرف،عوام سے ہے یا خواص سے، جدید تعلیم یافتہ حضرات سے ہے یا نو جوانوں سے یا سن رسیدہ بزرگوں سے۔اسی طرح مخاطب اور مدعو بدلنے پر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس وقت دعوت کا مخاطب کون ہے؟ اور اس کے لیے کون سا طریقۂ دعوت مناسب ہے؟ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ گفتگو مخاطب کے ذہن وفکر کو سامنے رکھ کر اور موقع ومحل کی مناسبت سے کی جائے،بالکل اسی طرح جس طرح بیج کے نشو ونما پانے کے لیے صرف بیج کی صلاحیتوں پر ہی اعتماد نہیں کیا جاسکتا، بلکہ زمین کی تیاری اور موسم کی سازگاری کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

۲۲۔نعمتوں سے محرومی کا خوف دلانا

دعوت وتبلیغ کے اسالیب میں سے ایک اسلوب یہ ہے کہ مخاطبین دعوت کو اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں حاصل ہیں، وہ انہیں یاد دلائی جائیں اور انہیں متنبہ کیا جائے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں، تاکہ یہ نعمتیں برقرار رہیں اور انہیں باخبر کیا جائے کہ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کیا اور کفر کی روش جاری رکھی تو یہ نعمتیں زائل ہوسکتی ہیں اور اللہ کا عذاب آسکتا ہے۔حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک موقع پر ایک عرب کی

غلطی پر تمام عربوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم لوگوں سے اللہ کے دیئے ہوئے شرفِ انسان کو چھین لو؟ اللہ کی قسم! تم لوگ ایسی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ تم سے واپس لے گا جو تمہارے پاس ہے اور اسے غیروں کو عطا کر دے گا''۔[۳۱]

۲۳۔ ہر حال میں مدعو کی ہدایت کی فکر

داعیانِ دین کو چاہیے کہ اپنے مخاطبین کو ہمہ وقت اپنی بے غرضی اور ایثار کا احساس دلاتے رہیں اور ان کی ہدایت کی فکر ہر وقت ان کے ذہن و دماغ پر مستولی رہے۔ ہر نبی نے اپنے مخاطبین کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس دعوت کے ذریعے کوئی ذاتی مفاد یا مالی منفعت حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ کو شدید جسمانی تکالیف سے گزرنا پڑا، مگر آپؐ نے اپنے دشمنوں کے لیے دعائے خیر ہی کی۔ فرمایا:

اللھم اغفر لقومی فانھم لایعلمون[۳۲]	اے اللہ! میری قوم کو بخش دے۔ یہ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

طائف کے سفر میں آپؐ سے جو سلوک روا رکھا گیا اس سے کون آگاہ نہیں، مگر آپؐ نے تکلیف پہنچانے والوں کے حق میں بد دعا نہیں کی، بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کے راہ یاب ہونے کی امید رکھی۔ جب فرشتوں نے آپؐ سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دیا جائے تو آپؐ نے فرمایا:

بل أرجو ان یُخرج اللہ من أصلابھم من یعبد اللہ وحدہ لایشرک بہ شیئاً۔[۳۳]	نہیں، بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اسی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ بالکل شرک نہ کریں گے۔

۲۴۔ عزم و استقلال

عزم و استقلال کی بنیاد درحقیقت انسان کے یقین پر ہوتی ہے۔ رسول اللہ

ﷺ کو اپنے خدائی مشن کی کامیابی کا اس درجہ یقین حاصل تھا کہ آپؐ جب تنہا تھے تب بھی اپنے کام کے بارے میں ہر طرح کے کامل عزم کے حامل تھے، جب دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے تب بھی آپؐ کا عزم کامل تھا اور جب فتوحات کا در وا ہوا تب بھی آپؐ روزِ اول ہی کی مانند اپنے سفر پر گام زن تھے۔ کسی بھی مرحلے پر آپؐ کا اعتماد متزلزل نہ ہوا۔ آپؐ کا ہر قدم واضح اور ہر اقدام روشن تھا۔ دعوت اسلامی کو جبر و طاقت کے حربوں سے روکنے میں ناکامی کے بعد قریش مکہ نے لالچ کے راستے سے آپؐ کے عزم و استقلال کو چیلنج کیا اور آپؐ کے سامنے حکومت و بادشاہت، مال و دولت اور حسن کی پیش کش کی۔ یہ مواقع بہادر سے بہادر انسان کے بھی پایۂ ثبات کو ڈگمگانے کے لیے کافی ہوتے ہیں، مگر نبی اکرم ﷺ کے لیے یہ چیزیں بھی کوئی کشش نہیں رکھتی تھیں۔

جب قریش کو ہر طرح سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی جھنجھلاہٹ عروج پر پہنچ گئی تو انہوں نے آپؐ کے سرپرست چچا ابو طالب پر بہت دباؤ ڈالا، چنانچہ وہ بھی آپؐ کو نرمی کا مشورہ دینے لگے۔ اس پر آپؐ نے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

یا عم، واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی، والقمر فی یساری علی ان أترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ، أو اھلک فیہ، ما ترکتہ [۳۴]

اے چچا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لاکر رکھ دیں کہ میں یہ کام چھوڑ دوں تب بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے غالب کردے یا میں اسی راہ میں کام آجاؤں۔

رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ خود عملی طور پر عزم و استقلال کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش فرمایا، بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تلقین فرمائی۔ ایک مرتبہ مخالفین کی جانب سے مسلمانوں کو پہنچائی جانے والی تکالیف سے تنگ آکر بعض صحابۂ کرام نے آپؐ سے دعا کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا:

قد كان من قبلكم يؤخذ الرجل فيحفر له في الارض ثم يوتى بالمنشار فيجعل على رأسه فيجعل فرقتين مايصرفه ذلك عن دينه، ويمشط بامشاط الحديد مادون عظمه من لحم وعصب مايصرفه ذلك عن دينه، والله ليتمّنّ الله هذا الأمر حتى يسير الراكب مابين صنعاء وحضر موت مايخاف الا الله والذئب على غنمه ولكنكم تعجلون۔ ۳۵

تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ہیں انھیں زمین میں گاڑ کر اور ان کے جسموں پر آرے چلاکر ان کے دوٹکڑے کردیے گئے، مگر وہ اپنے دین سے نہیں پھرے۔ لوہے کی کنگھیوں سے ان کی کھالیں تک اتار لی گئیں اور ان کے گوشت نوچ لیے گئے، مگر وہ اپنے مذہب سے نہیں پھرے، اللہ کی قسم! اللہ اس کام کو پورا کرکے رہے گا، یہاں تک کہ صنعاء سے حضرموت تک آدمی سفر کرے گا، مگر اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوگا، ہاں اسے بس یہ ڈر ہوگا کہ کہیں اس کی بکریوں کو بھیڑیا نہ اچک لے جائے، لیکن تم لوگ جلدی کرتے ہو۔

حاصلِ کلام

امت کے ہر فرد پر دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری کسی نہ کسی درجے میں عائد ہوتی ہے، اس لیے دعوت کو کوئی مخصوص پیشہ ورانہ کام قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اسے دین کے دیگر شعبہ جات سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہر مسلمان اپنی جگہ ایک داعی ہے، جو اپنی اپنی ضرورت اور ماحول کے مطابق، گھر سے لے کر دفتر تک اور دکان سے لے کر بازار تک ملنے والے ان گنت مواقعِ دعوت کو اپنے اس فریضے کی انجام دہی میں استعمال کرسکتا ہے۔شرط صرف اتنی ہے کہ جو چیز ہم پہنچائیں اس کا صحیح اور مکمل علم ہمارے پاس ہو، اور ہم وہ دردمند دل رکھتے ہوں جو پوری دل سوزی کے ساتھ دعوتی ذمے داری کی انجام دہی کر سکے۔ اس سلسلے میں ہمارے لیے مشعلِ راہ صرف اور صرف تعلیمات نبوی ﷺ ہی ہوسکتی ہیں۔

حواشی ومراجع

۱ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ رب مبلغ اوعی من سامع، ۶۷

۲ جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر، ۲۱۶۹

۳ ڈاکٹر خالد علوی، رسول اکرم ﷺ کا منہاج دعوت، دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴

۴ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ج ۱، ص ۵۸۱

۵ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب وجوب غسل البول وغیرہ من النجاسات، ۲۸۵

۶ آلوسی، روح المعانی

۷ صحیح مسلم، باب فی المساجد، ۶۷۴

۸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ

۹ صحیح مسلم، حوالہ سابق

۱۰ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب بعث ابی موسیٰ ومعاذ الی یمن، ۴۳۴۷

۱۱ صحیح بخاری، کتاب العلم باب ما کان النبی یتخولھم بالموعظۃ الحسنۃ، ۶۹

۱۲ صحیح بخاری، کتاب الوضوء، ۲۲۰

۱۳ ابن اثیر، ابوالحسن علی بن ابی البکر محمد بن الجزری (م ۶۳۰ھ)، اسد الغابۃ، تذکرہ حاطب بن ابی بلتعۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن، ج ۱، ص ۳۶۲

۱۴ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر التوبۃ، ۴۲۵۱

۱۵ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب ما یکرہ من السجع فی الدعاء، ۶۳۳۷

۱۶ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، ۲۶۸۲

۱۷ موطا امام مالک، باب حسن الخلق

۱۸ جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی المداراۃ، ۱۹۹۶

۱۹ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من جعل لاھل العلم ایاما معلومۃ، ۷۰

۲۰ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، ۵۲

۲۱ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ، ۶۰۲۲

۲۲ مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحۃ، ۵۵

۲۳ بیہقی، شعب الایمان، دارالکتب العلمیہ، بیروت۔۱۹۹۰ء، ۷۴۴۸
۲۴ صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ، ۲۰۰۹
۲۵ صحیح بخاری، کتاب الدعوت، باب ما یکرہ من السجع فی الدعاء، ۶۳۳۷
۲۶ خطیب بغدادی، الکفایۃ فی علم الروایۃ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۷ھ، ص ۱۸۳
۲۷ مسند احمد، حدیث زید بن ثابت: ۱۱۰۸۔ ج ۶، ص ۲۳۸
۲۸ مؤطا امام مالک، کتاب الحج، باب اہلال مکۃ ومن بھا من غیرھم
۲۹ مسند احمد، ج ۷، ص ۳۸۱
۳۰ اسد الغابۃ، تذکرہ حاطب بن ابی بلتعۃ، ج ۱، ص ۳۶۲
۳۱ ابونعیم، الاصفہانی، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، تذکرہ سلمان فارسی، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، ج ۱، ص ۲۶۰
۳۲ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوۃ احد.....
۳۳ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم.....
۳۴ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۹۹۸ء، ج ۲، ص ۴، ۵
۳۵ سنن ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی الامیر یکرہ علی الکفر

☆☆☆

دعوت وتربیت- اسلام کا نقطۂ نظر

مولانا سید جلال الدین عمری

یہ کتاب دوطرح کے مضامین پر مشتمل ہے۔ کچھ مضامین دعوتی نوعیت کے ہیں، جن میں میں پورے زور اور قوت کے ساتھ امت کو فریضۂ دعوتِ دین کی ادائیگی کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ کچھ مضامین تربیتی اور اصلاحی نوعیت کے ہیں، جن میں امت کو اصلاح احوال کی جانب متوجہ کیا گیا ہے اور اس کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ صفحات: ۱۳۶، قیمت -/۵۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

نورِ محمدی کی اساطیری اختراع پردازی

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

صوفیۂ کرام اور مبتدعینِ امت نے صدیوں سے نورِ محمدی کا ایک اساطیری ہالہ بنا رکھا ہے۔ انھوں نے نورِ محمدی کے بارے میں طرح طرح کی جھوٹی حدیثیں بیان کرکے پورا ایک نظام تیار کردیا ہے۔ صوفیہ نے اس تصور کو خوب اچھالا اور بڑھایا ہے اور اہلِ بدعت نے اس پر نئی نئی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ لیکن امت کے محققین اور اصحابِ علم و دانش بھی اس طرح کی باتیں لکھنے لگیں تو یہ چیز موجبِ حیرت ہے اور باعثِ افسوس بھی۔ سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے شمارہ اپریل- جون ۲۰۱۰ء میں 'نبوت محمدی کی آفاقیت' اور شمارہ جولائی- ستمبر ۲۰۱۰ء میں 'نور محمدی کا دینی و تاریخی استناد' کے عنوان سے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے مقالات شائع ہوئے ہیں۔ ان میں انھوں نے نورِ محمدی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اول الذکر مقالہ میں انھوں نے 'نبوت محمدی' کے وجوب و ثبوت سے متعلق لکھا ہے:

''رسول اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کے وجوب کا اولین مرحلہ علم و ارادۂ الٰہی نے طے کردیا تو دوسرا مرحلہ آیا۔ صوفیائے کرام اور دوسرے علمائے باطن و عارفینِ حقیقت نے اسے نورِ محمدی، حقیقت محمدی/ احمدی جیسی تعبیرات سے ظاہر کیا ہے۔ تکوینی امور و مظاہر کی منتقلی ارادہ و علم الٰہی سے حضرت آدمؑ کی تخلیق کے ساتھ ان کی صلبِ مبارک میں بہ شکل نورِ محمدی ہوئی۔ صلبِ آدم سے پشت در پشت انبیاء کرام کی اصلاب میں منتقل ہوتی ہوئی حضرت ابراہیمؑ تک پہنچی اور صلبِ ابراہیمی سے وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی صلب میں منتقل ہوئی اور ان سے یکے بعد دیگرے اجداد نبوی کو ودیعت ہوتی رہی، تا آں کہ وہ والد ماجد جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی پشت سے والدۂ ماجدہ بی بی آمنہ بنت وہب زہری کے 'رحم مادر' میں نور بن کر اتری''۔ (ص ۱۵-۱۶)

اس پر مدیر محترم نے یہ نوٹ لگایا: ''اس طرح کی صوفیانہ یا فلسفیانہ تعبیرات کے لیے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔ یہ ذوقی چیز ہے۔ اس کی کوئی دینی یا تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ اسے اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے'' (ص ۱۶، حاشیہ) تو اس کے رد میں بہ طور استدراک پروفیسر صدیقی نے دوسرا مقالہ لکھا، جس میں اس تصور کے محض ذوقی ہونے کا رد کرتے ہوئے اسے کتاب وسنت اور تاریخ وسیرت سے مدلّل بتایا۔ انھوں نے تحریر کیا ہے:

''نورِ محمدی، حقیقتِ محمدی اور نبوتِ محمدی کی مختلف اصطلاحات وتعبیرات اہل طریقت میں زیادہ معروف ومقبول ہیں۔ متعدد اکابر صوفیہ نے، جو اسرار دین سے واقف اور کتاب وسنت کے متبحّر تھے، ان کا ذکر اور ان پر بحث ومباحثہ محض ذوق ووجدان کی بنا پر نہیں کیا ہے اور نہ صرف واہی تباہی روایات کی بنا پر۔ فکر وفلسفہ اور ذوق ووجدان سے زیادہ ان کا انحصار کتاب وسنت اور تاریخ وسیرت کے شواہد پر ہے''۔ (ص ۸۰)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کی اس بحث کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ انھوں نے اس کے اثبات کے لیے جو دلائل دیے ہیں وہ کتنے وزنی ہیں:

(۱) ڈاکٹر صاحب نے ایک خلطِ مبحث یہ کیا ہے کہ نورِ محمدی، حقیقتِ محمدی اور نبوتِ محمدی کو ایک ہی چیز کی مختلف تعبیریں قرار دیا ہے، حالاں کہ ان میں بہت فرق ہے۔ نور ایک چیز ہے اور نبوت دوسری چیز۔ انھوں نے ان تمام آیتوں اور حدیثوں کو، جو آں حضرت ﷺ کی نبوت کے بارے میں ہیں، نورِ محمدی کے اثبات میں پیش کیا ہے، حالاں کہ ان میں صرف آپؐ کی نبوت کا ذکر ہے، نور کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۲) ڈاکٹر صاحب نے قرآنی وتفسیری شواہد میں آیت اللّٰہُ أَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہُ (الانعام-۱۲۴) ''اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی نبوت کس کو عطا فرمائے'' پیش کی ہے اور اس پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ (ص ۸۰-۸۲) لیکن اس میں رسالتِ محمدی کا تذکرہ ہے، نورِ محمدی کا ہرگز ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایک دوسری آیت: إِنَّ اللّٰہَ اصْطَفَی آدَمَ وَنُوحاً وَآلَ إِبْرَاھِیْمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران: ۳۳) ''اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو سارے جہان سے'' بھی نقل کی ہے۔ (ص ۸۲-۸۳) لیکن اس میں بھی کہیں نورِ محمدی

کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نبوت کو 'نور' بنادیا۔ انھوں نے ساری بحث آں حضرت ﷺ کی نبوت سے متعلق کی اور اسے 'نورمحمدی' پر چسپاں کردیا۔

(۳) انھوں نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں متعدد احادیث بھی نقل کی ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی نورمحمدی کا ذکر نہیں ہے۔ سب نبوت کی صراحت کرتی ہیں، اسی لیے ڈاکٹر صاحب کو بار بار کہنا پڑتا ہے کہ نورمحمدی کہیے یا نبوت محمدی، دونوں ایک ہی ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم کی حدیث ''ان اللہ اصطفیٰ من وُلد ابراھیم اسمٰعیل ... و اصطفانی من بنی ھاشم'' نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''صحیح مسلم کی حدیثِ شریف اور اس کی شرح سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا وجود عنصری، جسے نورمحمدی کہیے یا حقیقت محمدی یا نبوت محمدی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک حضرت آدم علیہ السلام سے ہی منتقل ہوا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آپ کے والد ماجد کے صلب میں اور وقتِ وجود عنصری میں آپؐ کی ذات میں آیا''۔ (ص۹۲)

اسی طرح حدیث ''کنت اول النبیّین فی الخلق و آخرھم فی البعث'' نقل کرکے فرماتے ہیں:

> ''اس حدیث صحیح کا واضح مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی نبوت خلق وتخلیق کے لحاظ سے اولین تھی اور ظاہر ہے کہ آپؐ کی حقیقت و وجود بھی تخلیقِ اولین تھی اور اسی کو نورمحمدی کہا گیا ہے''۔ (ص۹۴)

خاتم النبیّین ﷺ کی فضیلت دیگر انبیاء پر متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن اس میں نورِ محمدی کہاں سے آ گیا؟

(۴) نورمحمدی سے متعلق بعض روایات، جو کتب حدیث وسیرت میں مروی ہیں، سب ضعیف، بلکہ موضوع ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ اس میں ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کیا: مجھے بتایئے کہ اللہ نے سب سے پہلے کس چیز کو پیدا کیا؟ آپؐ نے جواب دیا: ''اے جابر، اللہ نے تمام چیزوں سے قبل تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا کیا'' اسے نقل کرکے پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے لکھا ہے:

''یہ روایت تفصیل سے المواہب اللدنیۃ میں وارد ہوئی ہے، مگر یہ روایت صحیح نہیں ہے اور قصہ گو حضرات نے اس کو گھڑ لیا ہے''۔ (فتنۂ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان، اسلامی اکیڈمی، لاہور، ص ۱۴۵)

المواہب اللدنیۃ میں مذکور یہ روایت نہ سند کے اعتبار سے ثابت ہے اور نہ درایت کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''قلت یا رسول اللہ، بابی انت وامّی، أخبرنی عن اول شئ خلقہ اللہ تعالیٰ قبل الأشیاء، قال: یاجابر، ان اللہ تعالیٰ قد خلق قبل الاشیاء نور نبیّک من نورہ، فجعل ذلک النور یدور بالقدرۃ حیث شاء اللہ تعالیٰ، ولم یکن فی ذلک الوقت لوح ولاقلم، ولا جنۃ ولانار، ولا ملک، ولاسماء ولا أرض، ولا شمس ولاقمر، ولا جنّی ولا إنسی، فلما أراد اللہ تعالیٰ أن یخلق الخلق قسّم ذلک النور أربعۃ أجزاء، فخلق من الجزء الأول القلم، ومن الثانی اللوح، ومن الثالث العرش، ثم قسّم الجزء الرابع أربعۃ أجزاء، فخلق من الاول حملۃ العرش، ومن الثانی الکرسی و من الثالث باقی الملائکۃ، ثم قسّم الجزء الرابع أربعۃ أجزاء، فخلق من الاول السمٰوٰت، ومن الثانی الأرضین، و من الثالث الجنّۃ والنار''۔

(میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، مجھ کو مطلع فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ نے سب چیزوں کو پیدا کرنے سے پہلے کیا چیز پیدا کی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اے جابر! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی تخلیق سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا، تو یہ نور اپنی روشنی پھیلاتا رہا، جہاں جہاں اللہ چاہتا تھا، اس وقت لوح وقلم اور جنت وجہنم کا وجود نہ تھا، نہ فرشتے، نہ آسمان، نہ زمین، نہ سورج، نہ چاند، نہ جن اور نہ انسان کی تخلیق ہوئی تھی، پھر جب اللہ نے مخلوق کی تخلیق کا ارادہ کیا تو اس نور کو اس نے چار اجزاء میں بانٹ دیا۔

پہلے جزء سے قلم، دوسرے جزء سے لوح، تیسرے جزء سے عرش کو پیدا کیا، اور چوتھے جزء کو چار حصوں میں بانٹ دیا۔ اس کے پہلے جزء سے ان فرشتوں کو پیدا کیا جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں۔ دوسرے جزء سے کرسی کو، تیسرے جزء سے باقی فرشتوں کو پیدا کیا۔ چوتھے جزء کو پھر چار اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پہلے جزء سے آسمان بنائے، دوسرے سے زمین اور تیسرے سے جنت وجہنم۔)

اس روایت کو سب سے پہلے قسطلانی (م۹۲۳ھ) نے اپنی کتاب المواہب اللدنیۃ میں نقل کیا ہے۔ بعد میں حلبی (م۱۰۴۴ھ) نے السیرۃ الحلبیۃ میں، عجلونی (م۱۱۶۲ء) نے کشف الخفاء میں اور مولانا اشرف علی تھانوی (م۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب میں بیان کیا ہے، لیکن یہ روایت سراسر من گھڑت ہے۔ اس کی سند کا کچھ پتا نہیں اور متن کا جو کچھ حال ہے وہ واضح ہے۔ اس میں تخلیقِ اشیاء کی جو تقسیم در تقسیم کی گئی ہے وہ عجیب وغریب ہے۔

(۵) جو لوگ 'نورمحمدی' کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور سے ہوئی ہے، جب کہ یہ صراحتاً غلط اور باطل عقیدہ ہے۔ یہ سب تناسخ اور حلول کی شکلیں ہیں جو 'توحیدِ خالص' کی اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نور حق ہے، لیکن اس سے نورمحمدی کے نکلنے کا ثبوت نہ کلام پاک میں ہے، نہ کسی صحیح حدیث میں، بلکہ یہ صوفیہ، مبتدعین اور گم راہ لوگوں کی ایجاد ہے۔ اس سلسلے میں مشہور عالمِ دین مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے ایک مضمون سے ایک اقتباس نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون ابھی کچھ عرصہ قبل سہ ماہی مجلّہ افکار عالیہ مئو کے جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء کے شمارہ میں دوبارہ شائع ہوا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''یہ عقیدہ رکھنا کہ آں حضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور سے پیدا ہوئے ... نہ صرف یہ کہ جہالت ہے، بلکہ صریح کفر ہے۔ اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ ذاتِ الٰہی کا نور مادہ ہوا آپؐ کی پیدائش کا۔ گویا آپ ذات الٰہی کے جزء سے ہیں۔ العیاذ باللہ۔ یہ عقلاً وشرعاً غلط ہے، کیوں کہ ذاتِ الٰہی کا نور مادّی نہیں ہوسکتا اور مجرّد من المادۃ کے لیے مادّیات کا مادہ

ہونا ممکن نہیں۔ جو لوگ اس باطل عقیدہ پر قائم ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور سے پیدا ہوئے ان کا استدلال ایک لمبی روایت کے اس فقرہ سے ہے ''ان اللہ تعالیٰ خلق قبل الاشیاء نور نبیّک من نورہ'' پوری روایت قسطلانی نے کتاب المواھب اللدنیۃ میں ذکر کی ہے۔ قسطلانی نے یہ روایت مصنّف عبدالرزاق سے نقل کی ہے۔ [صفحہ کے نیچے یہ نوٹ ہے: ''مصنّف عبدالرزاق گیارہ جلدوں میں چھپ چکی ہے، لیکن یہ روایت اس میں کہیں نہیں ہے۔ یہ روایت بالکل بے سند اور بے اصل ہے''۔ ص ۲۹] حدیث کی سند نہ قسطلانی نے ذکر کی ہے اور نہ حضرت شارح زرقانی نے اس کی سند بیان کی ہے۔ اس لیے اصول محدثین کے مطابق جب تک اس کی سند معلوم نہ ہو اس کی صحت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اور جب تک صحیح حدیث سند سے رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو، اس پر کوئی عقیدہ مبنی نہیں ہوسکتا''۔ (ص ۲۹)

آگے مزید فرماتے ہیں:

''غرض جس قدر صحیح روایات اوّلِ خلق کے متعلق ہیں، کسی میں اس کا ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے نور سے نبی کا نور پیدا کیا۔ اس لیے یہ حدیث تمام صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ ایک حدیث، جو واعظوں اور قصّہ خوانوں نے مشہور کر رکھی ہے کہ ''اوّل ماخلق اللہ نوری'' یہ محدثین کے نزدیک بالکل بے اصل، بلکہ موضوع ہے''۔ (ص ۳۱)

اس تفصیل سے ثابت ہوجاتا ہے کہ نور محمدی کی کوئی اصل نہیں ہے، اس کا تذکرہ جن روایات میں ملتا ہے، سب بے اصل اور من گھڑت ہیں۔ اس کا ذکر نہ قرآن میں آیا ہے نہ کسی صحیح حدیث میں، جب کہ نبوت محمدی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ نبوت محمدی اور نور محمدی دونوں کو خلط ملط کرنا علمی اعتبار سے درست نہیں ہے۔

☆☆☆

نوٹ: اس موضوع پر دونوں نقطہ ہائے نظر قارئین کے سامنے آگئے ہیں۔ اس لیے اس پر آئندہ مزید بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ (ادارہ)

تعارف وتبصرہ

مذاہب میں عورت کا مقام- ایک تقابلی مطالعہ محمد یونس قریشی

ناشر: قریشی اینڈ سنز پبلشرز، وارانسی (یوپی) تقسیم کار: نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی-۶، سنۂ اشاعت: ۲۰۱۰ء، صفحات: ۳۳۹، قیمت: ۲۰۰ روپے

اسلام نے عورت کو کتنا اعلیٰ مقام دیا ہے اور اس کے کتنے بیش قیمت حقوق متعین کیے ہیں اس کا صحیح اندازہ اس صورت میں لگایا جاسکتا ہے جب دیگر مذاہب میں اس کی حیثیت اور اس کو عطا کردہ حقوق کی تفصیلات بھی سامنے ہوں۔ اسی وجہ سے موجودہ دور میں عربی، انگریزی اور اردو زبانوں میں مسلم علماء اور دانش وروں نے اس موضوع پر جو کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کی ابتدا میں دیگر مذاہب میں عورت کی حیثیت سے بھی بحث کی ہے، لیکن عموماً یہ بحث مختصر ہے اور ثانوی مراجع کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں عورت کے مقام و مرتبہ کے تعلق سے ہندومت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان تعلیمات کو اصل مصادر (Original Sources) سے نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہندو دھرم شاستروں کے اقتباسات سنسکرت میں، بائبل کے اقتباسات انگریزی میں اور قرآنی آیات کو عربی میں درج کیا گیا ہے، ساتھ ہی ان کا اردو ترجمہ بھی تحریر کیا گیا ہے۔

یہ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے: (۱) عورت کی ابتدا (۲) شادی (۳) شادی کی اقسام اور طور طریقے (۴) کثیر الازواجی اور کثیر الشوہری (۵) مطلّقہ یا بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی (۶) طلاق (۷) طائفہ (۸) دیوداسی (۹) ستی پرتھا (۱۰) شوہر اور بیوی کے باہمی حقوق و فرائض (۱۱) رسم پردہ (۱۲) تعلیم نسواں (۱۳) حقِ وراثت (۱۴) عورتوں کو حقِ شہادت (۱۵) عورتوں کی حالت۔ ہر باب میں فاضل مصنف نے متعلقہ موضوع پر ہندومت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کو الگ الگ معروضی انداز میں پیش کیا ہے، لیکن ان کے تقابل سے اسلام کی برتری ظاہر ہوتی

ہے اور واضح ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب نے عورت کو جو حیثیت دی ہے اور اسے جو حقوق عطا کیے ہیں، ان کے مقابلے میں اسلام نے اسے کہیں زیادہ بلند مقام پر فائز کیا ہے اور کہیں زیادہ حقوق مرحمت کیے ہیں۔

اس کتاب کے ذریعے خاص طور سے ہندومت میں عورت کی بڑی الم ناک تصویر سامنے آتی ہے، اس کا خلاصہ مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ ''دھرم شاستروں کے مطابق گو کہ ہندو بیوی اردھانگنی (جسم کا نصف حصہ) اور دیوی کہی گئی ہے، پھر بھی مکمل طور سے غلامی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے (ص ۲۳۵) ہندو مذہبی کتابوں میں عورت کو جھوٹ کا مجسّمہ، بھیڑیوں جیسے دل والی، استرے کی دھار، زہر اور آگ کی خاصیتوں کی حامل اور شودر جیسی قرار دیا گیا ہے (ص ۲۹۵، ۳۰۵ و مابعد) اسے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی (ص ۲۶۴) میراث میں اس کا کوئی حق نہیں تھا (ص ۲۰۴) شادی کے وقت شوہر کے ساتھ سات پھیرے لگانے کے بعد اس سے علٰیحدگی اور طلاق کا کوئی تصور نہیں تھا (ص ۱۴۱) شوہر کے انتقال کے بعد اسے بھی شوہر کی چتا کے ساتھ جلا دیا جاتا تھا۔ اسے ستی پرتھا کہتے تھے (ص ۱۹۶ و مابعد) اگر کوئی عورت ستی ہونے سے بچ جاتی تو پوری زندگی گھٹ گھٹ کر جینا اس کا مقدّر رہوتا تھا۔ عورتوں کی دوبارہ شادی یا بیوہ عورتوں کی شادی کا کوئی تصور نہیں تھا (ص ۱۰۴) عصمت وعفّت کی کچھ اہمیت نہ تھی۔ چنانچہ نیوگ کے نام سے انتہائی گھناؤنی رسم جاری تھی، جس کے مطابق اگر شوہر سے اولاد نہ ہورہی ہو تو عورت کو اجازت تھی کہ خاندان کے کسی فرد سے جنسی تعلق قائم کرکے اولاد حاصل کرلے (ص ۸۱-۸۴) مندروں میں رقّاصہ عورتوں کا (جنھیں دیوداسیاں کہا جاتا تھا) نظم کیا جاتا تھا۔ اس کے لیے حسین وجمیل لڑکیوں کو خریدا جاتا تھا اور انھیں 'دان' بھی کرایا جاتا تھا۔ یوں تو کہنے کو ان کی شادی دیوتاؤں کی مورتیوں سے کرادی جاتی تھی، لیکن حقیقت میں وہ مندروں کے پروہتوں اور پنڈتوں کی جنسی تسکین کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ اس طرح دورِ وسطیٰ کے مندر زنا کاری اور عیّاشی کے اڈّے بن گئے تھے اور ان کو راجاؤں کی سرپرستی حاصل تھی (ص ۱۸۸) لڑکیوں کی شادی کسی بھی عمر میں ہوسکتی تھی اور

کم سن لڑکی کی بڑی عمر کے مرد سے شادی میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی تھی (ص۳۲) تعدد ازدواج اور کثیر شوہری کا رواج تھا، یعنی ایک مرد بہ یک وقت کئی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا تھا اور ایک عورت کے کئی مردوں سے جنسی تعلقات ہوسکتے تھے (ص ۷۸-۸۱) ان تمام باتوں کی تائید میں مصنف نے ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں کے حوالے دیے ہیں اوران کی اصل عبارتیں مع ترجمہ پیش کی ہیں۔

فاضل مصنف نے ہر بحث کے بعد اس کا خلاصہ بھی بیان کیا ہے۔اس سے مضامین کو ذہن نشیں کرنے میں مدد ملتی ہے۔لیکن اس کی خامی یہ ہے کہ اس میں بہت سے سابقہ حوالوں اور اقتباسات کو دہرایا ہے، جس کی بنا پر تکرار پائی جاتی ہے۔آیاتِ قرآنی کے ساتھ احادیثِ نبوی پر بھی اعراب لگانے کا اہتمام کیا گیا ہے، لیکن اس میں کثرت سے غلطیاں ہیں۔ پروف کی غلطیاں بھی خاصی ہیں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لیے کئی مقامات پر 'جبرالامت' تحریر ہے، جب کہ صحیح تلفظ 'حبر الامۃ' ہے۔(حبر عالم کو کہتے ہیں) الفاظ کی بعض ترکیبیں طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔مثلاً ایک عورت کے کئی مردوں سے جنسی تعلقات کے لیے 'کثیر الشوہری' کی ترکیب استعمال کی گئی ہے (شوہر فارسی لفظ ہے، اس پر عربی کا الف لام داخل کر دیا گیا ہے) مصنف نے ہندو مذہبی کتابوں اور بائبل کے تو مکمل حوالوں کا (جلد، صفحہ، باب، آیت، اشلوک وغیرہ کی صراحت کے ساتھ) اہتمام کیا ہے، لیکن یہ اہتمام احادیث کے حوالوں میں نظر نہیں آتا۔ان کے ضمن میں عموماً صرف کتاب کا نام لیا گیا ہے، باب وغیرہ کی صراحت نہیں اور بہت سے مقامات پر ان کا اندراج یا تو بلا حوالہ ہے، یا صرف 'حدیث' لکھ دیا گیا ہے۔ وہ حدیث کس کتاب میں آئی ہے، یہ مذکور نہیں (ملاحظہ کیجیے صفحات: ۱۶۹-۱۷۰-۲۳۱-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۸-۲۶۶-۲۸۹) ایک جگہ **اطلبوا العلم ولو بالصین** (علم حاصل کرو اگرچہ وہ چین میں ملے) کو حدیث رسول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے (ص۲۶۶) حالاں کہ محققین کے نزدیک یہ بے اصل ہے اور اس کا انتساب اللہ کے رسول ﷺ کی جانب درست نہیں۔ (ملاحظہ کیجیے علامہ محمد ناصر الدین الالبانی، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، المکتب

الاسلامی بیروت، ۱۹۸۵ء، ۱/۴۱۳-۴۱۶، روایت نمبر ۴۱۶)۔

بعض مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے اسلام کی جو ترجمانی کی ہے وہ ناقص، کم زور یا غلط ہے۔ مثلاً 'پردہ' کے ضمن میں انھوں نے عیسائیت کی تعلیم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بائبل میں اس کے لیے دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک ویل (Veil) اور دوسرا روب (Robe)۔ ویل کا مطلب ہے پتلے اور ہلکے بنے ہوئے کپڑے کا دوپٹہ جسے چہرے اور سر کو ڈھکنے کے لیے پہنا جاتا ہے۔ اسے ایک قسم کا نقاب (Hood) کہا جاسکتا ہے۔ اور روب کا مطلب ہے لمبا ڈھیلا ڈھالا لہراتا ہوا لباس، جسے دوسرے کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے۔ اسے لبادہ (Gown) کہا جاسکتا ہے، جو ٹخنے سے لے کر کندھے تک لمبا ہوتا ہے (ص ۲۴۸-۲۴۹) پردے کے لیے اسی طرح کے دو لباسوں کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ ایک خمار، یعنی اوڑھنی جس کا ذکر سورۂ النور: ۳۱ میں ہے۔ اسے اندرون خانہ استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور دوسرا جلباب، یعنی گاؤن جس کا تذکرہ سورۂ الاحزاب: ۵۹ میں ہے، اسے گھر سے باہر نکلتے وقت پہننے کی تاکید کی گئی ہے۔ مصنف نے دونوں آیتیں نقل کی ہیں، لیکن خمار اور جلباب کی نہ کوئی تشریح کی ہے نہ دونوں میں کوئی فرق بتایا ہے۔ 'عورت کے حقِ شہادت' کی بحث میں اسلام کی ترجمانی بہت مجمل اور سرسری ہے، جس سے احکام شریعت اور ان کی حکمتیں پوری طرح واضح نہیں ہو پائی ہیں۔ اس موضوع پر صدر ادارۂ تحقیق مولانا سید جلال الدین عمری نے اپنی تصانیف 'عورت اسلامی معاشرہ میں'، اور 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ' میں مفصّل اور مدلّل بحث کی ہے، جس سے اس سلسلے میں کیے جانے والے اعتراضات کا پوری طرح ازالہ ہوجاتا ہے۔ تعدّد ازواج کی بحث میں مصنف نے اسلام میں 'لونڈیوں سے جنسی تعلق کی اجازت' کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لونڈی سے جنسی تمتّع کے لیے ضروری ہے کہ اسے سب سے پہلے آزاد کردیا جائے، اس کے بعد اس سے نکاح کیا جائے، بشرطے کہ یہ نکاح اس کی رضامندی سے ہونا چاہیے، جیسا کہ محمد ﷺ نے خود عملاً کیا تھا۔ آپؐ نے جتنی بھی لونڈیوں سے نکاح کیا

انھیں سب سے پہلے آزاد کردیا، اس کے بعد ان کی رضامندی حاصل کرکے ان سے نکاح کرلیا (ص۹۱) اسی نقطۂ نظر کی بنا پر انھوں نے ازواج مطہرات کی تعداد ایک جگہ تیرہ لکھی ہے (بیش تر مسلم محققین حضرت ماریہؓ اور حضرت ریحانہؓ کو لونڈیوں میں شمار کرتے ہیں، اس بنا پر ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ بتاتے ہیں) اگرچہ دوسری جگہ وہ خود بھی ان کی تعداد گیارہ لکھ گئے ہیں (ص۳۳۰) صحیح اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ مسلمان مردوں کے لیے بہ یک وقت چار عورتوں سے نکاح کی اجازت آزاد عورتوں کے سلسلے میں ہے، لونڈیاں اس سے مستثنیٰ تھیں، اور ان سے جنسی تعلق کے لیے ان کی رضامندی سے ان سے نکاح کرنا ضروری نہ تھا۔ یہ سماج میں لونڈیوں کے مسئلے کو حل کرنے کی ایک تدبیر تھی۔

ان معمولی فروگزاشتوں سے قطع نظر یہ کتاب اپنے موضوع پر بھرپور اور مستند معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کے مصنف جناب محمد یونس قریشی لا انٹر کالج دیوریا (یوپی) میں انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی کتاب 'لاالہ الا اللہ- ایک سائنسی تبصرہ' اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔ امید ہے، زیرنظر کتاب کو بھی علمی حلقوں میں قبول عام حاصل ہوگا اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (اس کا ہندی زبان میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے جو مدھر سندیش سنگم، ابوالفضل انکلیونئ دہلی سے دست یاب ہے۔) (محمد رضی الاسلام ندوی)

امام ابن شہاب زہریؒ اور ان پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ حافظ محمد عبدالقیوم

ناشر: شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور، صفحات: ۱۶+۱۰۳، قیمت -/۱۰۰ روپے

امام ابن شہاب زہریؒ (۵۱-۱۲۴ھ) کا شمار جلیل القدر ائمہ حدیث میں ہوتا ہے۔ وہ مشہور تابعین میں سے ہیں۔ انھوں نے تقریباً بیس صحابۂ کرام کو دیکھا اور ان سے فیض اٹھایا تھا۔ ان سے دس ہزار سے زائد احادیث مروی ہیں، جو تمام کتبِ حدیث بہ شمول صحیح بخاری و صحیح مسلم میں پائی جاتی ہیں۔ ماضی قریب میں احادیث نبوی میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والوں نے ان سے وابستہ اہم شخصیات کو مطعون کرنے کا بیڑا اٹھایا تو

امام زہری کی شخصیت بھی نہ بچ سکی۔ اس سلسلے میں مشہور مستشرق گولڈ زیہر (Gold ziher) (۱۸۵۰-۱۹۲۰ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ اس نے لکھا کہ زہریؒ اموی حکم رانوں کے لیے احادیث گھڑا کرتے تھے۔ بعد میں کچھ نام نہاد مسلم محققین بھی اس مشن میں لگ گئے، چنانچہ جناب تمنا عمادی نے انھیں مجروح ٹھہرایا اور ان پر تدلیس، ارسال اور ادراج کے الزامات لگائے۔ آخر میں جناب خالد مسعود (شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی) اور جناب شہزاد سلیم (شاگرد جناب جاوید احمد غامدی) نے بھی اپنی تحریروں میں انہی الزامات کو دہرایا اور امام زہری کو ناقابل اعتبار ٹھہرانے کی کوشش کی۔ زیرنظر کتاب میں امام زہریؒ کے بارے میں معترضین کے تمام اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں امام زہری کے احوال و آثار کا تذکرہ ہے۔ باب دوم میں مسلم معترضین کے اعتراضات کا اور باب سوم میں گولڈ زیہر کے اعتراضات کا رد کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال کی روشنی میں امام زہری کی ثقاہت ثابت کی ہے اور معترضین کے شکوک وشبہات کا بھرپور رد کیا ہے۔ گولڈ زیہر کے اعتراضات تو انھوں نے اسی کے الفاظ میں نقل کیے ہیں، لیکن مسلم معترضین کے سلسلے میں ایسا نہیں کیا ہے۔ مناسب تھا کہ پہلے ان کے اعتراضات انہی کے الفاظ میں نقل کیے جاتے، پھر ان کا جواب دیا جاتا۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر حافظ محمد عبدالقیوم شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر اور شش ماہی علمی وتحقیقی مجلّہ 'الاضواء' کے مدیر ہیں۔ وہ قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس اہم موضوع پر اپنی تحقیق پیش کی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور اس کا فائدہ عام کرے۔ (م-ر)

احیائے دین اور ہندوستانی علماء — ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی

ناشر: القلم پبلی کیشنز، بارہمولہ، کشمیر، تقسیم کار: اردو بک ریویو، نئی دہلی-۲۰۱۱ء، صفحات ۳۰۴، قیمت: ۲۱۰ روپے۔

گذشتہ دو صدیوں کے دوران برصغیر ہند میں کئی ایسی نمایاں شخصیات پیدا

ہوئیں جنھوں نے احیائے اسلام کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔سید احمد شہید (۱۷۸۶-۱۸۳۱ء) اور شاہ اسماعیل شہید (۱۷۷۹-۱۸۳۱ء) نے خالص عقیدۂ توحید کی دعوت کے ساتھ ملت میں جہاد وشہادت کی روح پھونکی اور استعماری طاقتوں کے خلاف مؤثر مزاحمت کرکے آزادئ وطن کی راہ ہموار کی۔مولانا حمیدالدین فراہی (۱۸۶۲-۱۹۳۰ء) نے حاکمیت الٰہ کے تصور کو نمایاں کیا۔مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) نے 'حزب اللہ' کے قرآنی خاکے کی تفصیل فراہم کرکے ملک پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے انگریزوں کے خلاف جنگ اور اسلامی تحریک کو دوش بدوش کھڑا کردیا۔علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) نے عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا اور ساتھ ہی اپنی تحریروں کے ذریعے اسلامی نظریۂ حکومت کے خدّ وخال واضح کیے۔اس کے علاوہ یہاں بیسویں صدی میں دو ایسی تحریکیں (تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی) برپا ہوئیں جو دین کی تبلیغ اور اس کی اقامت کے میدان میں سرگرم ہیں۔ان کے بانیان مولانا محمد الیاس (۱۸۸۶-۱۹۴۴ء) اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) نے اپنے اپنے طور سے احیائے دین کی خدمت انجام دی ہے۔ بعد میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۳-۱۹۹۹ء) اور مولانا محمد منظور نعمانی (۱۹۰۳ء-۱۹۹۷ء) نے مولانا مودودیؒ کے تصور دین پر نقد کیا اور احیائے دین کے لیے اپنے طریقۂ کار کی نشان دہی کی۔موجودہ دور میں مولانا وحیدالدین خاں دین کی ترجمانی اور اس کی دعوت کے سلسلے میں اس حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں کہ ان کا فکر امت کے اب تک کے فکر سے مختلف اور متضاد ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں احیائے دین کے تعلق سے ان علماء کے افکار کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف کے بہ قول ''پیش نظر کتاب کوئی باقاعدہ مرتب تصنیف نہیں، بلکہ منتخب مقالات کا مجموعہ ہے، جو مختلف اوقات میں تحریر کیے گئے تھے اور اب موضوع کی مناسبت سے انھیں یکجا کردیا گیا ہے''۔(ص ۸)

فاضل مصنف ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی شعبہ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ان کے درجنوں تراجم وتصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

عالمی تحریکاتِ اسلامی پر ان کی خصوصی نظر ہے۔ اس موضوع پر ان کی تصانیف 'تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے تناظر میں' اور 'جدید ترکی میں اسلامی بیداری' علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔ ان کی یہ تازہ کاوش بھی انشاء اللہ دادِ تحسین حاصل کرے گی۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے برصغیر میں گذشتہ دو صدیوں میں غلبۂ اسلام کی جدو جہد کی روداد کا پتا چلتا ہے۔ اس سے اس راہ کے نشیب و فراز کے ساتھ مسافرانِ اقامت دین اور آرزومندانِ غلبۂ اسلام کی گرم جوشیوں اور کوتاہیوں کی تفصیلات بھی سامنے آتی ہیں۔ ان سے آئندہ کے لیے خطوط کار کی بہتر تعیین بھی ہوسکتی ہے اور تحریک کو اور زیادہ مؤثر، فعّال، نتیجہ خیز اور غلطیوں و کوتاہیوں سے پاک بھی بنایا جاسکتا ہے۔

کتاب کے سبھی مقالات قیمتی اور مفید ہیں، خاص طور سے تحریک شہیدین اور 'حزب اللہ' سے متعلق مقالات گراں قدر ہیں۔ مولانا مودودیؒ کی فکر اور تحریک کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا وحیدالدین خاں کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ بھی جان دار ہے، البتہ بعض مقامات پر فاضل مصنف کا لب و لہجہ سخت ہوگیا ہے، جس کا انھیں بھی اعتراف ہے۔ مضامین پر نظر ثانی کرتے وقت اسے معتدل کیا جاسکتا تھا۔

کتاب کے ابتدائی مضامین میں سید احمد شہید و شاہ اسماعیل شہید، مولانا فراہی، مولانا ابوالکلام، اور مولانا سید سلیمان ندوی کے افکار کا مطالعہ مثبت اور معروضی انداز میں پیش کیا گیا ہے، لیکن اگلے تمام مضامین میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر پر نقد کرنے والوں کے افکار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، خود مولانا مودودی کی سیاسی فکر اور احیائے اسلام کے لیے ان کی جدّ و جہد پر مثبت اور معروضی انداز سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

بہر حال زیر نظر کتاب آج کے تغیر پذیر حالات میں تحریک اسلامی کی تفہیم کے سلسلے میں ایک اہم کوشش قرار دی جاسکتی ہے۔ دین کو غالب اور سربلند دیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ (محمد جرجیس کریمی)

معاشرتی اصلاح-قرآن کریم کی روشنی میں مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی

ناشر: الفلاح پبلیکیشنز، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵، ۲۰۱۰ء، قیمت: ۴۰ روپیے

قرآن کریم ہدایتِ الٰہی کا سرچشمہ ہے۔ اس کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں۔ اس میں جہاں ایک طرف عقائد، عبادات اور اخلاقیات کے متعلق ہدایات ہیں، وہیں اس نے معیشت و معاشرت اور سیاست وحکومت کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ زیرنظر کتاب میں انسانی زندگی کے ان تمام گوشوں کے متعلق قرآنی تعلیمات کو واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے کہ قرآن حقیقت میں کتابِ اصلاح ہے، وہ انسانی زندگی سے فساد ختم کرنے اور اصلاح کرنے پر زور دیتا ہے، پھر بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی اصلاح کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے عقائد درست ہوں، اسے معلوم ہو کہ اس کا خالق و مالک کون ہے؟ اور اس کی ہدایات ہم تک کیسے پہنچی تھیں؟ اس کے بعد عبادات کا مرحلہ آتا ہے۔ فاضل مصنف نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عبادت جہاں ایک طرف الٰہ واحد کے خالق و مالک ہونے کا اقرار اور اپنی بندگی و عاجزی کا عملی اعتراف ہے، وہیں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اخلاقیات کے ضمن میں فضائل اخلاق (جس سے آراستہ ہونا چاہیے) اور رذائل اخلاق (جن سے اجتناب کرنا چاہیے) بیان کیے ہیں۔ معاشرتی اصلاح کا طریقہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جہاں مرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بیوی کے حقوق ادا کرے اور اس کے ساتھ بہترین سلوک کرے، وہیں بیوی کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مرد کی قوامیت کو تسلیم کرے۔ بلا شبہ ایک پرسکون خاندان کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں۔ معاملات سے بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اگر معاملات درست ہوں تو اس کے خوش گوار اثرات سماج پر پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں حدود وتعزیرات، وصیت اور وراثت کے احکام بیان کیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ فاضل مصنف نے آسان زبان میں قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی

اصلاح کا طریقہ بتایا ہے۔

ایک جگہ سورۂ المومنون کی آیت نمبر ۸۸ ''وَھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ'' کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ ''اور وہ پناہ دیتا ہے، خود اسے پناہ کی ضرورت نہیں'' (ص ۱۵۶) آیت کے دوسرے جز کا ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے یہ ترجمہ کیا ہے: ''وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کسی کو پناہ نہیں دی جاسکتی (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۴۵) تقریباً یہی ترجمہ دیگر اردو مترجمین نے بھی کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید اور کارآمد کتاب ہے۔ فاضل مصنف عظیم دینی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ میں استاد تفسیر ہیں، اس سے پہلے بھی ان کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ امید ہے اس کتاب سے بھی دینی حلقوں میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔ (مزمل کریم فلاحی قاسمی)

ثنائے جمیل — مرتب: ڈاکٹر محمد شہاب الدین

ناشر: یونی ورسل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۲، دسمبر ۲۰۰۹ء، صفحات: ۸۸، قیمت: -/۸۰ روپے

ڈاکٹر محمد شہاب الدین کی اردو نثر میں حج کے سفرناموں پر ایک ضخیم کتاب 'اردو میں حج کے سفرنامے' شائع ہوچکی ہے [اس پر تبصرہ کے لیے ملاحظہ کیجیے تحقیقات اسلامی، جولائی-ستمبر ۲۰۱۰ء]۔ اسی نثر نوردی کے دوران انھیں نظم کے جواہر پارے بھی ملے۔ ان میں سے حمد و مناجات، نعت، سلام و منقبت، کیفیاتِ حجاز اور رباعیات کا ایک انتخاب انھوں نے زیرِ نظر مجموعے میں جمع کر دیا ہے۔

سرزمین طیبہ اور نبی ﷺ سے منسوب ساری چیزوں سے عقیدت کا اظہار، مدینہ پہنچنے کی تڑپ، روضۂ اقدس پر حاضری کی خواہش اور خانۂ کعبہ کی زیارت وغیرہ نعت کے روایتی مضامین ہیں۔ اس مجموعہ کی نعتوں میں بھی فراق وحسرت کی جگہ وصال وہم نوائی کی لذتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعض نعتیہ اشعار غزل کا رنگ لیے ہوئے ہیں:

ان کا خیال ، ان کی یاد ، ان کا ہی ذکر و داستاں!
شکر خدا کہ اب نہیں ایک نفس بھی رایگاں

(ماہرالقادری)

قاضی محمد شکیل عباسی کی نعت استعاروں، تلمیحوں اور دیگر صنعتوں کے استعمال کی بہت خوب صورت مثال ہے۔اس کے دو اشعار درج ذیل ہیں:

نہیں پھر تو خیر حواس کی ، وہ ہو چاہے کوئی کلیم ہی
جو نقابِ حسن بس اک ذرا، فقط ایک پل کو سرک گئی
یہ کس آفتاب کے ربط سے شبِ ماہِ زیست چمک گئی
ملی آدمی کو وہ روشنی جو لحد سے عرش تلک گئی

بارگاہِ مصطفوی میں سلام پڑھنے کی ایک روایت رہی ہے۔نعیم صدیقی پاکستان میں اسلامی ادب کے بڑے ترجمان ہیں۔موجودہ دور میں اسلامی اور تعمیری ادب کو رومانیت کے لبادہ میں لپیٹ کر پیش کرنے والے وہ منفرد شاعر ہیں۔ان کا ایک سلام اس مجموعے میں شامل ہے۔اس کا ایک شعر یہ ہے:

جس کی ہر ایک سانس میں آپ کی یاد حل نہ ہو
ایسی فضول زندگی مجھ پر حرام اے حضور!

کہنے کو تو یہ سلام ہے، لیکن حقیقت میں ایسی نظم ہے جس میں ایک داعیِ اسلام نے اپنی عاجزی وانکساری کا اظہار کیا ہے۔

کیفیات حجاز کے نام سے جو نظمیں جمع کی گئی ہیں، ان میں سمندری سفر کی کیفیات منظر نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں:

نہ صحرا ہے نہ آبادی نہ گلشن ہے نہ ساحل ہے
دعا ہے موج ہے ارمان ہے یا پھر مرا دل ہے
کچھ اس انداز سے شکنیں پڑی ہیں فرش آبی میں
کہ جیسے بسترِ خاکی پر تڑپا کوئی بسمل ہے (وفا ڈبائیوی)

شفیق جون پوری کے یہاں شعری وسائل کی ندرت دیکھنے کے لائق ہے:

آنسو کے قطرے بن گئے تسبیحِ فاطمہؓ
تارے بچھا دیے مری آنکھوں نے راہ میں

اس مجموعے میں آزاد شاعری بھی ہے۔ 'اے ام القریٰ'، 'مدینہ کے نام'، 'یہ ہے شعبِ ابی طالب' اور 'اُحد کے شہیدوں نے آواز دی ہے'، خطابیہ شاعری کی اچھی مثالیں ہیں۔

کتاب کے آخر میں جرمن شاعر گوئٹے کی نعت کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس چیز کی اچھی مثال ہے کہ مذہبیات میں بھی ادب پایا جاتا ہے، جس کی قدردانی ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر محمد شہاب الدین کی یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ (محمد نظام الدین)

اسلام میں خدمت خلق کا تصور

مولانا سید جلال الدین عمری

اسلام نے خدمتِ خلق کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس کتاب میں خدمتِ خلق کی دینی حیثیت اور عبادت سے اس کا تعلق واضح کرنے کے بعد خدمت کے مختلف پہلوؤں، طریقوں اور ذرائع کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے مستحقین کا تذکرہ ہے۔ وقتی اور ہنگامی خدمات، مستقل خدمات، رفاہی خدمات اور اس مقصد سے قائم ہونے والے اداروں اور تنظیموں کی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں مروّج بعض غلط تصورات کی اصلاح بھی کی گئی ہے۔ وقت کے ایک اہم موضوع پر اردو میں پہلی مستند کتاب، صفحات: ۱۸۴، قیمت: =/۸۰ روپے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ Islam and service to mankind کے نام سے شائع ہوگیا ہے، صفحات: ۲۰۰، قیمت: -/۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۴۰)

☆ ادارۂ تحقیق کے جملہ وابستگان وبہی خواہان کے لیے یہ خبر بڑی باعثِ مسرت ہوگی کہ جماعت اسلامی ہند کی مجلس نمائندگان نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۔۷/اپریل ۲۰۱۱ء میں ۲۰۱۱ تا ۲۰۱۵ء کے لیے صدرِ ادارہ مولانا سید جلال الدین عمری کو دوبارہ امیر جماعت منتخب کرلیا۔دعا ہے کہ مولانا کی امارت میں جماعت کے کاموں کو مزید فروغ اور استحکام حاصل ہو۔

☆ دوبارہ امیر جماعت منتخب ہونے کے فوراً بعد مولانا عمری نے اپنی ذاتی دل چسپیوں اور جماعت اسلامی ہند کی سرگرمیوں اور مختلف ملّی، ملکی اور عالمی امور ومسائل کے بارے میں ایک مفصل انٹرویو دیا تھا، جو سہ روزہ دعوت نئی دہلی میں شائع ہوا تھا۔ان کی نظر ثانی کے بعد اب مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ صفحات:۵۲، قیمت:۔/۲۰روپے

☆ مولانا کا ایک کتابچہ، جوسفرحج کی روداد اور اس کے ضروری احکام ومسائل پر مشتمل ہے، 'سوئے حرم چلا' کے نام سے کئی سال قبل شائع ہوا تھا۔اب اس کا ہندی ترجمہ بھی 'کعبہ کا سفر' کے نام سے مرکزی مکتبہ سے شائع ہوگیا ہے۔

☆ رکن ادارہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی ایک کتاب 'اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت'، جو ادارہ کے منصوبہ کے تحت تیار کی گئی تھی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔صفحات:۸۴، قیمت:۔/۴۵روپے

☆ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک سمینار ۷۔۸/اپریل ۲۰۱۱ء کو بہ عنوان 'اسلام اینڈ ماڈرن چیلنجز' منعقد ہوا۔ادارہ کے کارکنان نے اس میں شرکت کی اور اپنے مقالات پیش کیے۔سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی کے مقالہ کا عنوان تھا: 'عصر حاضر کے چند مسلم مفکرین کے متجدّدانہ افکار کا جائزہ'۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے 'نظامِ خاندان کو درپیش چیلنجز اور اسلامی اقدار' اور مولانا محمد جرجیس کریمی نے 'جدیدیت اور علمائے اسلام' کے عنوانات سے مقالات پیش کیے۔ اس سے قبل سکریٹری اداہ نے فروری میں شعبۂ عربی، اے ایم یو علی گڑھ میں منعقدہ سمینار

میں 'شیخ محمد الغزالی کی فقہ السیرۃ: ایک تعارف' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔

☆ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے کچھ اور سمیناروں میں بھی شرکت کی۔ ایک بین الاقوامی سمینار ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ اسلام آباد اور ہائر ایجوکیشن کمیشن پاکستان کے اشتراک سے بہ عنوان 'دور جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات' ۲۶-۲۸/ مارچ ۲۰۱۱ء میں منعقد ہوا۔ اس میں 'برّ صغیر ہند میں بچوں کا سیرتی ادب (اردو زبان میں)' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور سمینار کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔ ۲۳-۲۴/ اپریل کو شعبۂ دینیات (سنّی) مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اشتراک سے 'حقوقِ انسانی اقلیتی حقوق کے تناظر میں' کے عنوان پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں 'اسلام میں حقوق انسانی کا تصور' اور دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ اور اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے اشتراک سے منعقدہ عالمی سمینار بہ عنوان 'علمائے فرنگی محل کی خدمات' ۲۰-۲۲/ مئی لکھنؤ میں 'مولانا عبدالحی فرنگی محلی علمائے عرب و عجم کی نظر میں' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

☆ ۲۷/ مارچ ۲۰۱۱ء کو ادارہ میں ایک توسیعی خطبہ بہ عنوان 'اسلام: مشن اور تاریخ کے درمیان' کا انعقاد کیا گیا۔ یہ خطبہ ڈاکٹر راشد شاز نے پیش کیا۔ اس پروگرام کی صدارت شعبۂ انگریزی، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سابق صدر پروفیسر مسعود الحسن نے فرمائی۔ اہل علم اور اصحاب ذوق نے خاصی تعداد میں اس پروگرام میں شرکت کی۔

☆ ادارہ میں زیر تربیت اسکالرس کا رائٹرس فورم الحمدللہ سرگرم ہے۔ اس کے تحت وقتاً فوقتاً طلبا اپنی مشق کے لیے مقالے پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں جناب انس بلال ندوی نے ایک مقالہ بہ عنوان 'ڈاکٹر حمیداللہ کی سیرت نگاری' مارچ ۲۰۱۱ء کے آخر میں پیش کیا۔

☆ ۲۲/ مئی ۲۰۱۱ء کو تحقیقات اسلامی کے مقامی مقالہ نگاروں کی ایک میٹنگ رکھی گئی، جس میں مجلّہ کے معیار کو بہتر بنانے اور اس کے لیے مقالات کی فراہمی کے طور طریق پر غور کیا گیا۔

☆ ۳۰/ مئی ۲۰۱۱ء کو کچھ مقامی دانش وروں اور ادارہ کے بہی خواہوں کی ایک میٹنگ رکھی گئی، جس میں ادارہ میں کچھ ایسے نئے کورسز کے اجراء کے امکانات پر غور کیا گیا، جو ادارہ کے بنیادی نصب العین سے ہم آہنگ اور عصری تقاضوں کے مطابق ہوں۔

دو نئی مطبوعات

از

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

۱- اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت

زمانۂ نزول قرآن میں یہودیت اور عیسائیت دو بڑے مذاہب تھے۔ قرآن نے ان کے ماننے والوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور ان کی تحریفات اور انحرافات کی نشان دہی کرتے ہوئے واضح کیا کہ اسلام ہی اللہ کا اصل دین ہے، جسے لے کر ہر پیغمبر آیا تھا اور جس کے ساتھ اب آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ بھیجے گئے ہیں۔

اس کتاب میں ان بنیادی نکات کو نمایاں کیا گیا ہے جنھیں راہِ دعوت میں کام کرنے والوں کو دیگر اہل مذاہب سے گفتگو کرتے ہوئے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس مطالعہ میں قرآن کریم کو بنیاد بنایا گیا ہے اور قدیم وجدید کتبِ تفسیر سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ صفحات: ۸۴، قیمت: -/۴۵ روپے

۲- گھریلو تشدّد اور اسلام

گھریلو تشدّد (Domestic Violence) نے عالمی سطح پر سنگین صورت حال اختیار کرلی ہے اور دنیا کے تمام ممالک میں عورتیں اس کا شکار ہیں۔ اس کتاب میں اعداد وشمار کی روشنی میں اس مسئلہ کی سنگینی کا جائزہ لیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لیے کیا تدابیر اختیار کی ہیں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی کیا تاکیدی ہدایات دی ہیں۔ صفحات: ۸۰، قیمت: -/۳۰ روپے

-: ملنے کے پتے:-

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

R.No. 38933/81
JULY.....2011

Quartely
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

Mob. 9412562972
Phone: 0571-2902034
SEPTEMBER.....2011

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۴۰/-	۲۰	دولت میں خدا کا حق	۱۰/-
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/-	۲۱	انفاق فی سبیل اللہ	۳۰/-
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/-	۲۲	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/-
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۳۵/-۵۰	۲۳	اسلام اور مشکلات حیات	۲۰/۲۵
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۰۰/-	۲۴	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۰/-
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۸۰/-	۲۵	اسلام اور وحدت بنی آدم	۶/-
۷	معروف و منکر	۸۵/-	۲۶	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۸۰/-
۸	اسلام کی دعوت	۱۴۰/-	۲۷	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۰/-
۹	اسلام - ایک دین کی دعوت	۸/-	۲۸	جماعت اسلامی ہند - پس منظر خدمات اور طریق کار	۱۵/-
۱۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت - اہمیت اور تقاضے	۵/-	۲۹	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۶/-
۱۱	دعوت و تربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۰/-	۳۰	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۰/-
۱۲	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۲/-	۳۱	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/-
۱۳	عورت - اسلامی معاشرے میں	۱۶۰/-	۳۲	وقت حساب	۱۰/-
۱۱۴	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۸۰/-	۳۳	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچائیے	۱۰/-
۱۵	عبرت اور اسلام	۶۰/-۷۵	۳۴	اسلام کا شورائی نظام	
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/-	۳۵	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۰/-
۱۷	اسلام کا عائلی نظام	۸۵/-	۳۶	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۲/-
۱۸	بچے اور اسلام	۵/-	۳۷	سوئے حرم چلا	۱۵/-
۱۹	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/-	۳۸	دینی علوم کی تدریس	۱۲/-

ملنے کے پتے :

۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نئی مگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ ۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی - ۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵